حکومت بہار

اردو ڈائرکٹوریٹ

بہار، پٹنہ

سلسلہ نمبر۔۲۳

صدیق مجیبی

ڈاکٹر منظر حسین

Monograph-23

Siddeeq Mujeebi

By : Prof. Manzar Hussain

جدید غزل گو شعراء میں صدیق مجیبی کا نام معروف اور اہم ہے۔ وہ غیر منقسم بہار کے رسالدار نگر، ڈورنڈا رانچی میں ۷ جولائی ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق گدی یعنی مسلم گوالا برادری سے تھا۔ ان کے والد دودھ کا کاروبار کرتے تھے۔ جن کا نام مجیب الرحمن تھا۔ اُسی مناسبت سے آپ صدیق مجیبی لکھا کرتے تھے ۔ اردو میں ایم ۔اے اور پی ایچ ۔ڈی کرنے کے بعد صدیق مجیبی رانچی کے ایس ۔ایس۔ کالج میں لکچرر ہوئے۔ اُس کے بعد ان کا تقرر رانچی کالج، رانچی میں ہوگیا، جہاں سے وہ ۱۹۹۱ء میں سبکدوش ہوئے۔

صدیق مجیبی نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں اپنی شاعری کا حسن بکھیرا، مگر وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اگرچہ انھوں نے نظمیں بھی کہیں اور بہت خوب کہیں، مگر ان میں اکثر نظمیں ضائع ہوگئیں اور اب نظموں کا بہت تھوڑا حصہ دستیاب ہے۔ "دائرے میں چھپا ہوا دائرہ"، "احتساب"، "صندل کا شجر" اور "مفاہمت" اُن کی قابلِ مطالعہ نظمیں ہیں۔ اِن نظموں میں زندگی کی سچائیاں، احساسِ محرومی اور یاسیت کا رنگ نمایاں ہے۔

صدیقی مجیبی کی شناخت ایک جدید غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہے۔ وہ جدیدیت سے متاثر تھے، اس لئے ان کی شاعری میں استعاراتی نظام ملتا ہے، علامتیں ملتی ہیں۔ خواب، صحرا، سمندر، دریا، کشتی، موج، بھنور، حباب، بلبلہ، طوفان، سورج اور کربلا وغیرہ اُن کی غزلوں میں ایک بلیغ استعاراتی نظام کے تحت استعمال ہوئے ہیں۔ خدا کی ذات میں تشکیک کا پہلو بھی ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔

صدیق مجیبی کی شاعری میں کلاسیکی رنگ کے ساتھ رومانیت اور ترقی پسندی کا امتزاج ملتا ہے۔ فنی بصیرت، شعری حسیت اور تجربے کی شدت ان کی غزلوں کو ایک منفرد آہنگ اور طنطنہ سے ہمکنار کرتی ہیں۔ صدیق مجیبی فن میں زندگی کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں اور اسے زندگی کو بصیرت افروز کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جس کے سبب اُن کے فکر میں تازگی و توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی زبان سلیس اور بے حد دلکش ہے۔

صدیق مجیبی کی غزلوں کے دو مجموعے حسن طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ "شجرِ ممنوعہ" ہے جو ۱۹۹۶ء میں پروفیسر جابر حسین کی کاوشوں سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ان کی سو غزلیں ہیں۔ دوسرے مجموعے کا نام "پل صراط کے آگے" ہے، جسے ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے بابر مجیبی نے ۲۰۱۵ء میں شائع کرایا۔

صدیق مجیبی ۱۹۹۱ء سے لے کر ۱۹۹۷ء تک بہار اردو اکادمی کے نائب صدر نشیں بھی رہے۔ اپنی دو مدّتِ کار میں انھوں نے اردو اکادمی کی رونق اور افادیت میں اضافہ کیا اور اردو آبادی میں مقبول رہے۔ اردو کونسل ہند کے صدر شمائل نبی نے انھیں جھارکھنڈ ریاست کی کونسل کا صدر بنایا تھا تو انھوں نے اس کے توسط سے اردو زبان کے فروغ کی کئی کوششیں کیں۔

اس فردنامے کو پروفیسر منظر حسین نے تحریر کیا ہے۔ موصوف رانچی یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو ہیں اور "مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ سنٹر" کے ڈائرکٹر بھی۔ ان کا مطالعہ وسیع، گہرا اور تراشیدہ ہے۔ تنقیدی شعور بلیغ اور بالیدہ ہے۔ اُن کی دس ادبی تحقیقی اور تنقیدی تصانیف حسن طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں، جن میں "اقبال اور دانتے"، "تفہیم اور تعین قدر" اور "اقبال کا تصورِ تعلیم" وغیرہ اہم ہیں۔ صدیق مجیبی کو منظر حسین نے بہت قریب سے دیکھا۔ اُن سے ذاتی تعلقات رہے۔ وہ ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے بھی واقف رہے اس لئے انھوں نے صدیق مجیبی کے فن پر گہری نظر کے ساتھ ان کی شخصیت کا بھی بہتر تعارف پیش کیا۔ یہ فردنامہ صدیق مجیبی کی تفہیم میں ایک بہترین تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔

—— اسلم جاوداں

प्रकाशक

उर्दू निदेशालय

मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

صدیق مجیبی

ڈاکٹر منظر حسین

طابع وناشر:
اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔۲۳

Siddique Mujibi

By
Dr. Manzar Hussain

نام کتاب	:	صدیق مجیبی
مصنف	:	ڈاکٹر منظر حسین
سال اشاعت	:	2022ء
کل صفحات	:	95
کمپوزنگ وتزئین	:	عبداللہ
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	نیو فائن آرٹ آفسیٹ، درگاہ روڈ، پٹنہ۔٦

ملنے کا پتہ :
اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱
فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

فہرست

پیش لفظ	احمد محمود	4
ابتدائیہ	ڈاکٹر منظر حسین	6
صدیق مجیبی : ایک نظر میں	—	8
صدیق مجیبی : سوانحی احوال وکوائف	—	11
صدیق مجیبی کی غزلیہ شاعری کا فکری وفنی اختصاص	—	16
(الف) صدیق مجیبی کا نظریۂ شاعری		
(ب) موضوعات		
(ج) عصری حسیت		
(د) عشقیہ جذبات وکیفیات کی آئینہ داری		
(ہ) انانیت		
(و) تشکیک کا پہلو		
صدیق مجیبی کی شاعری میں استعاراتی نظام	—	44
صدیق مجیبی کی شاعری میں کربلا کا استعارہ	—	51
صدیق مجیبی کی غزلیہ شاعری کا اسلوب	—	57
صدیق مجیبی کی نظم نگاری	—	61
صدیق مجیبی نقادانِ فن کی نظر میں	—	64
انتخابِ کلام	—	72
کتابیات	—	94

پیش لفظ

دبستان لکھنؤ، دبستان دہلی اور دبستان دکن کی طرح اپنے مخصوص اور بیش قیمت شعری وادبی روایت اور سرمائے کی بنیاد پر دبستان بہار بھی ایک اہمیت کا حامل ہے۔

سرزمین بہار میں شعروادب کی یکتائے زمانہ اور باکمال شخصیتیں ہر دور میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کمالِ فن سے دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کرتی رہی ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، شوقؔ نیموی، فضلِ حق آزاد،، بیدل عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اورینوی، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلیم عاجزؔ، مظہر امام، عبدالصمد، شوکت حیات، احمد یوسف اور شفیع مشہدی جیسی بے مثل اور یکتائے زمانہ ادبی شخصیتوں نے پوری ادبی دنیا میں بہار کی شعری وادبی عظمت واہمیت کا پرچم لہرایا اور دبستان بہار کو مضبوط شناخت عطا کی۔ دبستان بہار کی شعری وادبی روایت اس قدر مقتدر اور وقیع ہے کہ دنیائے ادب اسے بڑی قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ دبستان بہار کی جملہ سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی وقیع خدمات شعروادب کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اسے نئی نسل تک پہنچانا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ نے گزشتہ دنوں دس مشاہیر ادب بہار ۱۔ شادؔ عظیم آبادی، ۲۔ پرویزؔ شاہدی، ۳۔ کلیم الدین احمد، ۴۔ رضا نقوی واہیؔ، ۵۔ علامہ واقفؔ عظیم آبادی، ۶۔ عبدالمغنی، ۷۔ وہاب اشرفی، ۸۔ رمزؔ عظیم آبادی، ۹۔ شین مظفر پوری، ۱۰۔ کلیم عاجزؔ کے فردنامے (مونوگراف) شائع کرائے۔ ان فردناموں کا ادبی دنیا میں زبردست استقبال کیا گیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کی اس پیش کش کو اہم اور قیمتی قرار دیا گیا نیز مزید مشاہر دبستان بہار پر فردنامے کی اشاعت کا مطالبہ بھی گیا ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ نے دانشوران شعروادب کی ایک اہم مشاورتی نشست میں مشوروں کے بعد اتفاق رائے سے مزید ۳۲ فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا۔ جن گراں قدر ادبی شخصیتوں پر فردناموں

کی اشاعت کا فیصلہ لیا گیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امداد امام آثر، ۲۔ فضل حق آزاد عظیم آبادی، ۳۔ شوؔق نیموی، ۴۔ انجم مانپوری، ۵۔ یاس یگانہ چنگیزی، ۶۔ بیدل عظیم آبادی، ۷۔ قاضی عبدالودود، ۸۔ جمیل مظہری، ۹۔ اختر اورینوی، ۱۰۔ سہیل عظیم آبادی، ۱۱۔ شکیلہ اختر، ۱۲۔ حسن نعیم، ۱۳۔ غیاث احمد گدی، ۱۴۔ کلام حیدری، ۱۵۔ احمد یوسف، ۱۶۔ صدیق مجیبی، ۱۷۔ احمد جمال پاشا، ۱۸۔ اویس احمد دوراؔں، ۱۹۔ لطف الرحمٰن، ۲۰۔ اسرار جامعی، ۲۱۔ جمیلہ خدا بخش، ۲۲۔ رشیدۃ النساء، ۲۳۔ بیتاب صدیقی، ۲۴۔ قمر اعظم ہاشمی، ۲۵۔ راسخؔ عظیم آبادی، ۲۶۔ عبدالغفور شہباز، ۲۷۔ پیغام آفاقی، ۲۸۔ غلام سرور، ۲۹۔ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ۳۰۔ مظہر امام، ۳۱۔ اجتبیٰ رضوی، ۳۲۔ کیف عظیم آبادی۔

صدیق مجیبی کا شمار بہار کے جدید شعراء میں ہوتا ہے۔ان کا خاص میدان عمل اگر چہ غزل گوئی ہے لیکن انھوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں، قطعات اور قصائد بھی کہے ہیں۔ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''شجر ممنوعہ'' اور دوسرا مجموعہ ''پُل صراط کے آگے'' شائع ہو چکا ہے۔ان کے مطالعے سے ان کے ایک بلند پایہ شاعر ہونے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس فرد نامے کے مصنف پروفیسر منظر حسین رانچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں صدر شعبہ کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔آپ کا مطالعہ بہت وسیع اور تنقیدی شعور بہت پختہ ہے۔صدیق مجیبی سے ان کے ذاتی مراسم رہے۔قربت کے سبب انھیں شاعر کو سمجھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔انھوں نے صدیق مجیبی کی شخصیت اور اُن کی شاعری پر محیط یہ فرد نامہ بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔لہٰذا یہ ایک معتبر مستند تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ قارئین کو اردو ڈائرکٹوریٹ کی یہ پیش کش ضرور پسند آئے گی۔

احمد محمود

ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

صدیق مجیبؔی کا شمار جدید غزل گو شعرا میں کافی اہم ہے اور نمایاں بھی۔اُن کا تخلیقی سفر تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔اس طویل مدت میں انہوں نے کتنے نشیب و فراز دیکھے۔سائنسی ایجادات اور مغربی علوم کی رحمتیں اور زحمتیں بھی دیکھیں اور ادبی اُفق پر ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال بھی دیکھا۔فرائڈ کی دروں بینی اور اس کے نفسیاتی تجزیے کی مقبولیت بھی دیکھی۔اس کے علاوہ علامت نگاری، رومانیت، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات و پسِ ساختیات وغیرہ جیسے نظریات و رجحانات کی موافقت و مخالفت میں گروہ بندی کا منظر بھی دیکھا لیکن مجیبی نہ تو کسی ازم کے ثناخواں رہے اور نہ ہی کسی مخصوص نظریے کے اسیر۔ان کی شاعری کلاسکیت، رومانیت اور ترقی پسندی تینوں کا قابل قدر اور منفرد امتزاج ہے۔

صدیق مجیبی کا شمار اردو غزل کی ان معتبر آوازوں میں ہوتا ہے جن کے یہاں احساس کی تازگی، جذبے کی شدت اور فکر کی گونج دور دور تک سنائی دیتی ہے۔انہوں نے غزل کی قدیم تہذیبی روایتوں سے بھی اکتساب فیض کیا ہے اور جدید رجحانات سے بھی استفادہ کیا۔ان کی غزلوں کے مطالعے سے ایک ایسے شاعر کا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے جس کی شاعری میں حالات کا کرب بھی ہے اور کلاسیکی بلوغت بھی۔ان کے کلام میں حسن ادا بھی ہے اور جرأت فکر کے ساتھ ساتھ عصری حسیت بھی۔ان کی آواز اپنے تجربوں کی آواز ہے جس کی گونج نہ صرف ذہنوں کو جھنجھوڑتی ہے بلکہ قاری کے دلوں کی دنیا کو بھی تہہ و بالا کر دیتی ہے۔

صدیق مجیبؔی کے دو شعری مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں جو ان کی غزلوں پر مشتمل ہیں۔پہلا مجموعہ ''شجر ممنوعہ'' کے نام سے پروفیسر جابر حسین کی کاوشوں سے 1996 میں شائع ہوا۔یہ مجموعہ صدیق مجیبی کی ایک سو غزلوں پر مختص ہے۔دوسرا شعری مجموعہ صدیق مجیبی کے انتقال کے بعد ان کے ان کے لائق فرزند بابر مجیبی نے ''پل صراط کے آگے'' کے نام سے 2015ء میں شائع کرایا۔یہ مجموعہ بھی صدیق مجیبی کی ایک سو غزلیات پر مختص ہے۔صدیق مجیبی نے غزلوں کے علاوہ نظمیں، قطعات اور قصائد بھی کہے ہیں لیکن مذکورہ دونوں مجموعوں میں شامل نہیں ہیں۔تلاشِ بسیار کے باوجود سبھی نظموں کا سراغ نہیں لگ سکا۔چند نظموں کا تجزیہ ممکن ہو سکا ہے۔میں نے اس فرد نامہ کو مختلف عنوانات کے تحت کئی ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب صدیق مجیبی کے سوانحی احوال وکوائف پر مختص ہے ۔ چونکہ اس کتاب کی حیثیت ایک فرد نامہ (Monograph) کی ہے۔اس کے اپنے حدود متعین ہیں ۔لہٰذا مونوگراف میں کسی فنکار کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل بحث نہیں ہوسکتی ۔کوشش کی گئی ہے کہ صدیق مجیبی کی شخصیت فکر اور فن کی تفہیم تفصیلی نہیں تو اجمالی طور پر ممکن ہو سکے۔ میں نے صدیق مجیبی کے سوانحی احوال وکوائف پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے ایک عنوان ’’صدیق مجیبی کی شاعری کی فکری وفنی اختصاص‘‘ قائم کیا ہے جس کے ذیلی عنوانات کے تحت ان کے نظریۂ شاعری موضوعات ،عصری حسیت ،عشقیہ جذبات و کیفیات کی آئینہ داری ، انانیت ،تشکیک کا پہلوان تمام عنوانات پر اشعار کے حوالے سے گفتگو کی ہے ۔صدیق مجیبی کی شاعری میں استعاراتی نظام کے لئے ایک باب مختص کیا گیا ہے ۔ دیگر استعاروں اور علامتوں کے علاوہ کربلا کا استعارہ صدیق مجیبی کی شاعری کا خاص موضوع رہا ہے ۔اشعار کے حوالے سے اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی غزلیہ شاعری کا اسلوب کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔صدیق مجیبی کی نظموں کی تعداد بہت ہی قلیل ہے پھر بھی ان کی نظم نگاری کے حوالے سے فکری وفنی رموز ونکات کی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔صدیق مجیبی کی شاعری پر نقادانِ فن نے اپنے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے تراشے قلم بند کر دیئے گئے ہیں جس کا عنوان ’’صدیق مجیبی نقادانِ فن کی نظر میں‘‘ ہے۔انتخاب کلام کے تحت ان کی اہم اور مقبول غزلوں ،نظموں اور ایک قصیدہ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

میں اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار کے ڈائرکٹر جناب احمد محمود کا صمیمِ قلب سے ممنون ہوں کہ انھوں نے صدیق مجیبی کے مونوگراف کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری مجھ ناچیز کے سپرد کی ۔اپنے عزیز دوست جناب اسلم جاوداں کی محبتوں کو فراموش نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اس مونوگراف کو مکمل کرنے کے لئے ہمیشہ متحرک کرتے رہے ۔ مجھے یقین ہے کہ مذکورہ مونوگراف صدیق مجیبی کی شاعری کی معنویت اور مقام کے تعین میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔

مونوگراف کی کمپوزنگ کے لئے اپنے عزیز عبداللہ کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ اس کتاب کی ترتیب وتزئین میں اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا اور آج یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

منظر حسین

فردنامہ : صدیق مجیبی

صدیق مجیبی : ایک نظر میں

نام : صدیق مجیبی

پیدائش : 7 جولائی 1931

مقام پیدائش : رسالدار نگر، ڈورنڈا، رانچی

والد کا نام : مجیب الرحمٰن

(والد کے نام کی مناسبت سے یہ لوگ مجیبی لکھتے ہیں)

والدہ کا نام : بی بی حفیظن

دادا کا نام : عظمت اللہ گدی

آبائی پیشہ : دودھ کا کاروبار

(اسی کاروبار کی وجہ سے یہ لوگ گدی کہلاتے ہیں)

ابتدائی تعلیم : مکتب، گھسیٹا صاحب کے مکتب میں

میٹرک پاس کیا : ضلع اسکول رانچی

کالج کی تعلیم : سنٹ زیویئر کالج، رانچی اور رانچی کالج، رانچی

ایم۔اے (اردو) : پرائیوٹ طور پر رانچی یونیورسٹی سے پاس کیا اور فرسٹ کلاس فرسٹ آئے۔

پی ایچ۔ڈی (اردو) : رانچی یونیورسٹی رانچی سے پروفیسر ش۔اختر کی نگرانی میں ''چھوٹا ناگپور میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا'' کے

موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

شاعری کی ابتداء : 1951ء

شعری مجموعہ : (ا) 1996ء میں پروفیسر جابر حسین کی کاوشوں سے ''شجر ممنوعہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں صدیق مجیبی کی سو غزلیں شامل ہیں۔

(۲) صدیق مجیبی کے انتقال کے بعد 2015ء میں ان کے بیٹے بابر مجیبی نے دوسرا مجموعہ ''پل صراط کے آگے'' کے نام سے شائع کرایا۔

ملازمت : 1955ء میں ایک امریکن کمپنی جمشید پور میں Chief Investigator کی حیثیت سے جوائن کیا۔ 1961ء میں یہاں سے استعفیٰ دے کر بریلی چلے گئے جہاں سینتھیٹک ربڑ پلانٹ Safty Security Officer کے طور پر ملازمت اختیار کر لی۔ 1964-65 میں بمبئی چلے گئے جہاں Atomic Power Station تاراپور میں Chief Scurity Officer کی حیثیت سے جوائن کیا لیکن یہ کمپنی ہندوستان سے باہر چلی گئی لہٰذا وہ رانچی واپس لوٹ آئے۔ رانچی واپسی کے بعد اُردو ادب کی طرف رجوع ہوئے۔ ایم۔اے۔ (اردو) کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔اے۔ کرنے کے بعد رانچی کے ہی ایک کالج ایس۔ایس۔ میموریل کالج میں لیکچرر کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ کچھ سال کے بعد انہوں نے رانچی کالج، رانچی میں لیکچرر کی حیثیت سے جوائن کر لیا۔

ملازمت سے سبکدوشی : 1991ء

بہار اردو اکیڈمی وائس چیئرمین
کی حیثیت سے تقرری اور مدت:۔ 1991-1997

صدیق مجیبی کے معاصرین:۔اختر پیامی، کلام حیدری، انور عظیم، شکیل الرحمٰن، پرکاش فکری، وہاب دانش، سید احمد شمیم، منظر کاظمی، ذکی انور وغیرہ

صدیق مجیبی کی اولاد : 5 بیٹے اور دو بیٹیاں

صدیق مجیبی کا انتقال : 16 مارچ 2014 بوقت بارہ بجے دن کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

تدفین : رسالدار نگر، ڈورنڈا (رانچی) قبرستان میں

سوانحی احوال وکوائف

صدیق مجیبی کی پیدائش گوالہ ٹولی محلّہ معروف بہ رسالدار نگر دورنڈہ (رانچی) میں 7 جولائی 1931 کو ہوئی۔ والد کا نام محمد مجیب اور والدہ کا نام حفیظن تھا۔ والد کے نام کی مناسبت سے ہی یہ لوگ اپنے نام کے ساتھ مجیبی لگاتے ہیں۔صدیق مجیبی کے دادا کا نام عظمت اللہ گدی اور پردادا کا نام عبدالرحمٰن گدی تھا۔ان کا آبائی پیشہ دودھ کا کاروبار تھا لیکن عبدالرحمٰن گدی اس زمانے میں بھی تعلیم کی اہمیت و افادیت سے نا آشنا نہ تھے۔انہوں نے اپنے بیٹے محمد مجیب کو انگریزی سیکھنے کے لئے کلکتہ بھیجا تھا۔حاجی محمد مجیب گدی کو اللہ تعالیٰ نے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں عطا کی تھیں۔صدیق مجیبی ان میں سب سے بڑے تھے ۔ان کی پیدائش کے متعلق ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔صدیق مجیبی کی پیدائش سے پہلے محمد مجیب کو تین فرزند ہوئے جو یکے بعد دیگرے فوت کرتے چلے گئے جس کے نتیجے میں ان کی اہلیہ بی بی حفیظن کے ذہن و دماغ پر غم کا اتنا اثر پڑا کہ ان پر جنون کی کیفیت طاری ہوگئی۔خاندان کے تمام افراد پر رنج وغم اور مایوسی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے کہ محمد مجیب کے یہاں بچہ ولادت کے بعد فوت کرتا جارہا ہے۔اسی درمیان ایک خدارسیدہ بزرگ کی آمد ان کے گھر پر ہوئی اور اس فقیر کی دعاء نے اپنا اثر دکھایا فقیر نے ہدایت کی کہ جب اگلا بچہ پیدا ہو تو دو برس کے بعد اسے اپنے گھر سے نکال کر کسی دوسرے مکان میں اس کی پرورش و پرداخت کی جائے۔صدیق مجیبی اللہ کے کرم اور فقیر کی دعاؤں کے اثر سے 7 جولائی 1931 کو اپنے آبائی گھر واقع گوالہ ٹولی (رسالدار نگر) میں پیدا ہوئے۔خدارسیدہ بزرگ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے صدیق مجیبی کو دو سال کی عمر پوری ہونے پر ان کے والد نے ان کو علیم الدین الہٰ آبادی نام کے ایک شخص کے سپرد کردیا۔یہ حضرت اسی محلے سے متصل بی۔ایم۔پی کوارٹر میں سکونت پذیر تھے۔وہ بی۔ایم۔پی میں سپاہی کے عہدے پر فائز تھے اور خراب بندوقوں کو ٹھیک کرنے کا کام کرتے تھے۔ چونکہ صدیق مجیبی کے والد اور

علیم الدین الٰہ آبادی کے مکان کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔لہٰذا ان دونوں کی فیملی میں ربط وضبط بھی بہت گہرا ہو گیا تھا۔ چونکہ علیم صاحب کا تعلق الٰہ آباد سے تھا جس کے نتیجے میں صدیق مجیبی کی زبان پر بھی اس کا خاصا اثر پڑا۔صدیق مجیبی کی بسم اللہ کی تقریب کافی دھوم دھام سے منائی گئی۔ بعد میں گھسیٹا صاحب کے مکتب میں داخل کرایا گیا۔اوراس طرح ان کی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھا۔صدیق مجیبی کے حالات زندگی کے سلسلے میں ان کے صاحبزادے ڈاکٹر بابر مجیبی کی تحریر زیادہ مستند ومعتبر ہے جو انہوں نے صدیق مجیبی کے دوسرے شعری مجموعے ’پل صراط کے آگے‘ کے مقدمے میں قلم بند کیا ہے۔

’’ڈاکٹر صدیق مجیبی گدی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی پیدائش ڈورنڈہ کے گدی محلے میں 7 جولائی 1931ء کو ہوئی۔یہ محلّہ تقریباً 100 سال پرانا ہے۔ تعلیمی اعتبار سے گدی قبیلے کے لوگ اس وقت دور جاہلیت میں جی رہے تھے۔لیکن جس خانوادے سے صدیق مجیبی کا تعلق ہے اس کے علم وادب کا چرچہ آج بھی ہوتا ہے۔ان کے پردادا عبدالرحمٰن گدی تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔اس بات کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صدیق مجیبی کے والد جناب محمد مجیب کو انگریزی سیکھنے کے لئے کلکتہ بھیجا تھا۔عظمت اللہ گدی (صدیق مجیبی کے دادا) کے چچازاد بھائی حسینی گدی بھی بے حد ذہین تھے ساتھ ہی حب الوطنی کا شدید جذبہ رکھتے تھے۔مہاتما گاندھی نے چمپارن سے جو تحریک شروع کی تھی اس میں وہ شامل تھے۔صاحب اقتدار ہونے کی وجہ سے کورٹ میں جوری کے آنرری ممبر بھی تھے۔اردو فکشن کی دو قد آور شخصیتیں غیاث احمد گدی اور الیاس احمد گدی ان ہی کے پوتے تھے۔جن کے ادبی کارناموں سے کوئی بھی اردو کا قاری ناواقف نہیں۔عظمت اللہ گدی کے دوسرے چچازاد بھائی مولانا کرم علی فرنگی محل لکھنؤ کے کسی مدرسے سے فارغ التحصیل تھے۔انہوں نے 1908ء میں ایک مذہبی کتاب بھی ترتیب دی تھی۔وہ دھنکی ڈیہہ مسجد کے امام وخطیب بھی تھے۔اس خاندانی پسِ منظر کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ جس گدی قبیلے نے پہلوان پیدا کئے ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھمائی اسی گدی قبیلے نے غیاث احمد گدی، الیاس احمد گدی اور صدیق مجیبی جیسے قلم کے سپاہی بھی پیدا کئے۔جن کے بارے میں کہا جاتا

ہے کہ یہ وہ اکابرادباء ہیں جنہیں فراموش کر کے جھارکھنڈ بہار تو کیا ہندوستان کی کوئی ادبی تاریخ لکھی گئی تو مؤرخ کے علم پر سوالیہ نشان لگ جائے گا۔‘‘

ڈورنڈہ کا گدی محلّہ حضرت قطب الدین رسالدار کے مزار سے دو سو گز کی دوری پر واقع ہے۔گدی، رسالدار بابا سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ان کے مزار پر سالانہ عرس اور قوالی کا رواج تھا۔(یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے) ان قوالوں سے صدیق مجیبی بہت متاثر تھے۔اس وقت بہزاد لکھنوی اور سیماب اکبرآبادی کی غزلیں، حالی کی مسدس اور اقبال کی نظم شکوہ جواب شکوہ کی بڑی دھوم تھی۔اس ماحول نے ان کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کئے اور ان کا ذہن قوالی گانے کی طرف راغب ہو گیا۔اکثر گھر پر اپنے ہم عمر دوستوں کو بلاتے۔کاٹھ کے بکسے کو ہارمونیم بناتے اور قوالی کی محفل سج جاتی۔قوالی میں گائے جانے والے اشعار نے ان کے شعری ذوق کو بیدار کر دیا اور وہ شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے۔BA کے زمانے میں اختر پیامی، کلام حیدری، انور عظیم، شکیل الرحمٰن، یوسف امام، وحید الحسن، بقاء اللہ، امر ہندی جیسے دوستوں کی صحبت میسر آئی۔اب جیسے انہیں ایک سمت مل گئی تھی۔شہر میں مشاعروں کا رواج بھی تھا۔مولانا ارشاد حسین بیتاب شعراء کے استاد تھے۔ان کے شاگردوں میں توحید رانچوی، نظر رانچوی، اثر رانچوی، اسحاق خاک مرادآبادی، مولانا سالک، سمیع اللہ شفق، شمس جاوید جیسے نوجوان شاعر موجود تھے۔ہفتے یا مہینے میں مشاعرے کی محفل ضرور جمتی۔صدیق مجیبی ان مشاعروں میں شرکت کرتے جس کے نتیجے میں ان کا شعری ذوق پروان چڑھا۔اسی دوران 1955ء میں ایک امریکن کمپنی Tisco جمشید پور، میں Chief Investigator کے عہدے پر فائز ہو گئے۔1961ء میں کمپنی سے ریزائن کر کے بریلی چلے گئے وہاں سنتھیٹک ربر پلانٹ میں Safety Security Officer کے طور پر ملازمت اختیار کر لی پھر 1964-65ء میں بریلی سے ممبئی گئے۔پہلے ایک 5 Star Company میں اور بعد میں Atomic Power Station Tarapur میں Chief Security Officer ہوئے۔لیکن یہ کمپنی بیرون ملک

منتقل ہوگئی اورصدیق مجیبی بیرون ملک جانا نہیں چاہتے تھے لہٰذا رانچی واپس لوٹ آئے ۔ جب واپس آئے تو یہاں کافی کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ ان کے پرانے دوست پرکاش فکری اور وہاب دانش جدیدیت کے تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے اور خاصے معروف بھی ۔ چونکہ بریلی اور ممبئی کے قیام کے دوران ان کی ملاقاتیں بڑے بڑے شعراء اور ادباء سے ہوتی رہی تھیں اس لئے صدیق مجیبی کا مزاج بھی جدیدیت کی تحریک سے وابستہ تھا۔ رانچی واپسی کے بعد وہ اردو ادب کے مطالعے کی طرف مائل ہوئے اور اردو میں ایم اے کرنے کا منصوبہ بنایا۔

ایم ۔اے کے فائنل امتحان کا زمانہ تھا کہ ان کی زندگی میں ایک بہت بڑا سانحہ پیش آیا۔ میری والدہ کے انتقال کا سانحہ۔ اس حادثے نے انہیں باہر سے اندر تک توڑ کر رکھ دیا۔ میرے بڑے بھائی محمد اسلم مجیبی اور قیصر مجیبی بتاتے ہیں کہ جس دن والدہ کا انتقال ہوا اس دن والد صاحب کا امتحان تھا۔ والدہ حمل سے تھیں اور جانتی تھیں کہ انہیں کسی بھی وقت ہسپتال جانا پڑسکتا ہے۔ چونکہ اس وقت میرے دونوں بھائی ہوشمند تھے سو ان کو بلا کر کہا ’’ کل تمہارے والد صاحب کا امتحان ہے۔ ان کے امتحان کا ایڈمٹ کارڈ اس بوام میں رکھ رہی ہوں ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ۔ اگر ہسپتال چلی جاؤں تو والد کو دے دینا اور سنو! اس میں کچھ پیسے بھی رکھ دیئے ہیں ضرورت پڑی تو لے لینا۔ لیکن انہیں پریشان نہ کرنا‘‘۔ تقدیر کا کھیل دیکھئے کہ اگلے ہی دن وہ ہو گیا جس کے لئے ذہنی طور پر کوئی تیار نہیں تھا۔ والد صاحب نے امتحان نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ سچ بھی ہے جس کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو جائے وہ بھلا امتحان کی طرف کیا سوچے۔ لیکن ان کے دوست واحباب اور خود ان کے والد محترم محمد مجیب صاحب نے انہیں سمجھایا اور تسلی دے کر انہیں امتحان دینے کے لئے تیار کیا۔ اسی حال میں وہ امتحان دینے گئے۔ ذرا سوچئے کہ اگر والدہ نے میرے بھائیوں سے یہ نہ بتایا ہوتا کہ ایڈمٹ کارڈ کہاں رکھا ہے تو شاید والد صاحب چاہ کر بھی امتحان میں شریک نہیں ہو پاتے۔ اللہ کا کرم دیکھئے کہ انہوں نے .M.A کے امتحان میں یونیورسٹی ٹاپ کیا۔ یہ حادثہ ان کی زندگی کا ایک

ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ اپنے اس اکیلے پن کو انہوں نے شاعری کے حوالے کر دیا۔ جس کا احساس ان کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔‘‘ 1؎

صدیق مجیبی نے ایم۔اے کے امتحان کے بعد سوسیولوجی میں بھی ڈپلوما کیا۔ ش اختر کی نگرانی میں ’چھوٹا ناگپور میں اردو زبان وادب کے ارتقاء‘ کے موضوع پر کام کر کے رانچی یونیورسٹی سے پی۔ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کئی جگہوں پر ملازمت کے بعد آخر میں رانچی کالج، رانچی میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے ان کی تقرری عمل میں آئی۔ جہاں سے وہ 1991ء میں سبکدوش ہو گئے۔ بعد ازاں ان کی تقرری بہار اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے 1991 میں عمل آئی جہاں وہ 1997 کے اواخر تک رہے۔

صدیق مجیبی نے شاعری کی ابتداء 1951 سے کی، شاعری میں ان کا اپنا ایک طرز تھا۔ ان کی شاعری میں فکر وفن کے تمام رموز ونکات موجود ہیں۔ ان کا ایک مخصوص انداز ہے۔ جمشید پور کے استاد شاعر سالک لکھنوی نے شہنشاہ غزل کے خطاب سے انہیں نوازا تھا۔

صدیق مجیبی کے معاصرین:۔

صدیق مجیبی کے معاصرین میں پرکاش فکری، وہاب دانش، منظر شہاب، سید احمد شمیم، سہیل واسطی، منظر کاظمی، ذکی انور وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

صدیق مجیبی کا انتقال:۔

صدیق مجیبی پر 15 فروری 2014 کی شام کو ہارٹ اٹیک کا حملہ ہوا۔ ان کی آواز بند ہوگئی، پہلے انہیں راج ہسپتال میں داخل کرایا گیا لیکن کوئی سدھار نہ دیکھ کر انہیں اپولو ہاسپٹل میں ریفر کر دیا گیا۔ علاج کے دوران ہی ان پر دوسرا اٹیک ہوا، آخر کار وہ موت سے شکست کھا گئے اور 6 مارچ 2014 بوقت 12 بجے دن داعئ اجل کو لبیک کہتے ہوئے ہمیشہ کے لئے ہم لوگوں سے جدا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ ان کی مغفرت کرے۔ اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ یقیناً صدیق مجیبی کے ادبی وعملی کارنامے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

❋

صدیق مجیبی کی غزلیہ شاعری کا فکری وفنی اختصاص

شاعری فنون لطیفہ کی اعلیٰ قسم ہے جو زندگی کی تعبیر بھی ہے اور واقعات ، حالات و حادثات کی تفسیر بھی۔ اس فن میں کائنات کے تمام مسائل، احوال وکوائف کی آئینہ داری بھی ہوتی ہے اور جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی۔ یہ ایک ایسا حسین وجمیل فن ہے جو فنکار کے باطن سے پھولوں کی خوشبو کی طرح پھوٹتی ہے اور پڑھنے والوں کے مشام جاں کو معطر ومعنبر کرتی رہتی ہے۔ اردو شاعری میں صنف غزل مقبول ترین صنف ہے جو اپنی ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے بہت ہی پر کشش، دلآویز اور موسیقیت کے لحاظ سے اہم رہی ہے اور ہر دور میں بے انتہا مخالفت کے باوجود زندہ پائندہ ثابت ہوئی۔ اس کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس نے اپنا رشتہ اپنی بنیادی سرشت اور شعریات سے ہمیشہ قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ غزل نے صنفی استحکام، روایت کی پاسداری، مضمون ومعنی آفرینی کی ندرت، موضوعات کے اختصاص کے معاملے میں اپنی انفرادیت اور امتیاز کے توازن کو آج تک سنبھالے رکھا ہے۔ اس صنف کے اپنے آداب، مطالبات اور تقاضے ہیں۔ اس میں ایک طرف جہاں جذبات واحساسات کے زیر وبم کی ترجمانی ہوتی ہے تو دوسری طرف خیالات کی لہریں بھی شروع تا آخر اپنی تحرک کا پتہ دیتی ہیں۔ اس کی جڑیں اس کی اپنی فطانت میں پیوست ہیں۔ اس صنف کی ہمہ گیر مقبولیت کا سبب اس کی تہذیبی اور ثقافتی قدریں بھی ہیں۔ اردو غزل نے بہت ہی صداقت، دیانت داری اور خلوص کے ساتھ اپنے عہد کے تہذیبی ارتقا اور ثقافتی نشو و نما کی ترجمانی کی ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ غزل ہی وہ صنف ہے جس میں مشترکہ کلچر کی جمالیات کی عکاسی بہتر طریقے سے کی گئی ہے۔ اسی طرح غزل میں حسن وعشق کے موضوع پر اردو میں جو قیمتی سرمایہ ہے وہ ادبیات عالیہ کی جان ہے۔ اس کی تاریخ بہت ہی طویل ہے اور اس کا سرمایہ اردو شاعری کا کوہ نور ہے۔ یہ صنف ہر عہد میں سرگرم رہی۔ فکری وفنی روایت اور ادبی لطافت وصلابت کے باوجود اس نے کئی طرح کے

نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ اس نے وقت اور زمانے کے ساتھ اپنے آپ کو بدلا۔ حسن وعشق کی داستان سرائی، معشوق سے محوِ گفتگو، لب ورخسار کی تعریف کے ساتھ ساتھ تصوف کے مسائل کی ترجمانی کو بھی اس صنف نے جگہ دی۔ مشترکہ ہنداسلامی تہذیب کے عروج وزوال، جلال وجمال اور وقار وتمکنت کو بھی بہت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹا۔ مختلف ادوار میں سیاسی وسماجی تغیرات نے اسے متاثر ضرور کیا لیکن اپنی فنی خصوصیات کی دلکشی اور دلآویزی کے سبب جہاں ایک طرف شاعروں کا مرکز ومحور بنی رہی تو دوسری طرف اردو غزل نے ارتقائی مرحلہ طے کرتے ہوئے نئے تجربات کیے۔ نئے موضوعات نئے الفاظ نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں، نئی علامات اور نئے استعارے غزل کے سانچے میں ڈھلتے رہے۔ عصری تقاضوں کے معنوی سطح پر عصری حسیات وترجمانی کے سلسلے میں لفظوں کے اصطلاحی مفہوم میں وسعت اور تہہ داری کو فروغ ہوا۔ زمانے کی تیز ہوا کے جھونکوں نے وارداتِ عشق کے چراغ کو بجھایا تو نہیں البتہ اس کی لو کو مدھم ضرور کر دیا جس کے نتیجے میں عاشق اور معشوق کی اہمیت ثانوی ہوگئی۔ کلاسیکی غزل میں ترک عشق وعاشقی کو گناہ کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ محبوب کے ناز ونخرے برداشت کرنے کو عشق کی معراج گردانا جاتا تھا۔ غالب بھی اس اذیت کو مسکرا کر برداشت کرتے رہے۔ ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

یا یہ شعر :

ترک کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

لیکن غزل جیسے جیسے ارتقائی شکل اختیار کرتی ہے محبوب سے قطع تعلق ایک عام سی بات ہونے لگی۔ عاشق ایک عرصے کے بعد محبوب سے بیزار نظر آنے لگتا ہے اور اس کی محبت بوریت کا شکار ہونے لگتی ہے۔ غزل کی کلاسیکیت کو گرہن لگنے لگا۔ اردو غزل میں ہیئت کے تجربے ہونے لگے۔ بیسویں صدی کے شروع میں غزل کی مخالفت اور نظم کی حمایت میں آواز اٹھنے لگی۔ ترقی پسند شعرا نے اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے جوش وخروش کے ساتھ غزل کے روایتی الفاظ کو نئے معنی دیے اور اشتراکی نظریے کے تحت معانی کے نظام میں وسعت پیدا کی اور غزل کی روایتی لفظیات کو نئے مفاہیم عطا کیے۔ 1955ء کے بعد جدیدیت

کے ادبی رجحان کے زیر اثر ذہنی کیفیات کے اظہار کے لیے پرانی علامتوں کو یکسر خارج کرتے ہوئے نئی طرز کے ساتھ نئے علائم کو پیش کیا گیا اس سے ابلاغ و ترسیل کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ مرغے کی چونچ میں سورج کو لا کھڑا کر دیا گیا۔ اینٹی غزل کے رجحان نے برہنہ گفتاری کو عام کیا جس کے نتیجے میں غزل کی پہلو داری اور تہہ داری کو جو اس صنف کا نمایاں اور قابل قدر وصف ہے صدمہ پہنچا۔ اسی طرح تغزل کا لفظی حصار ٹوٹا۔ روایتی عشق سے ہٹ کر جسمانی اور جنسی کشش کو غزل کا موضوع بنایا گیا۔ نئی غزل اور نئی نظم کہنے کا ماحول تیار کیا گیا کچھ اصولی اور نظریاتی بنیاد قائم کے گئے مثلاً ادب کی تخلیق کا عمل ادیب کا ذاتی اور انفرادی عمل ہے لہذا اس کے آزادانہ اظہار پر کسی طرح کی نظریاتی اور خارجی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ ادیب یا شاعر جو کچھ اور جس طرح بھی سوچتا ہے اس کے اظہار کا اسے پورا حق ہے۔ غزل کی شاعری میں کربلا کی اشاریت اور مظلومیت بطور استعارہ ایک نئی کیفیت اور معنویت کے ساتھ داخل ہوئی۔ اس طرح اردو غزل نے مختلف نشیب و فراز دیکھے لیکن غزل کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ 1960ء کے بعد جن فنکاروں نے اردو غزل کی غزلیہ شاعری میں اپنی تخلیقی توانائی کا لوہا منوایا اور اردو شاعری میں اپنا مقام مستحکم کیا بلا شبہ ان میں ایک اہم اور نمایاں نام صدیق مجیبی کا ہے۔ صدیقی مجیبی کا شمار اردو غزل کی ان معتبر آوازوں میں ہوتا ہے جن کے یہاں احساس کی تازگی، جذبے کی شدت اور فکر کی گونج دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ ان کا شعری سفر تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے کتنے نشیب و فراز دیکھے۔ سائنسی ایجادات اور مغربی علوم کی رحمتیں اور زحمتیں بھی دیکھی ہوں گی اور ادبی افق پر ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال سے بھی آشنا تھے۔ فرائڈ کی دروں بینی اور اس کے نفسیاتی تجزیے کی مقبولیت بھی دیکھی اس کے علاوہ علامت نگاری، رومانیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، ساختیات و پس ساختیات وغیرہ جیسے رجحانات و میلانات کی موافقت اور مخالفت میں گروہ بندی کا منظر بھی دیکھا لیکن مجیبی نہ تو کسی ازم کے علمبردار رہے اور نہ ہی کسی مخصوص نظریے کا۔ ان کی شاعری کلاسیکیت، رومانیت اور ترقی پسندی تینوں کا قابل قدر اور منفرد امتزاج ہے۔

صدیقی مجیبی کا نظریہ شاعری:

صدیق مجیبی کا ایک اپنا شعری موقف ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاعر زندگی کا صید بھی ہے اور صیاد بھی۔ اس کا سارا سرمایہ زندگی کی بصیرت اور ایک

درد دِل آشنا کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس کی نامرادیاں اور کامرانیاں، اس کا سوز و ساز، زندگی کے واسطے اور زندگی ہی کے وسیلے سے تشکیل پاتے ہیں۔ وقت اور حالات کی تبدیلیوں کا شعور کبھی اس سوز و ساز کو جاں گداز اور جاں سوز بنا دیتا ہے اور کبھی جرأت و حوصلہ دے کر اسے زہر بھرا جام پینے، زندگی کو رفعت بخشنے اور مسرت خیز بنانے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

شاعری الفاظ کے بے رنگ مطالب میں حسی تجربوں میں رنگ بھرنے، سماعی لذتوں کو روح پرور بنانے اور زندگی کو بصیرت افروز کرنے کا نام ہے۔ شاعری حسیات کی آئینہ دار اور جذبات کی ترجمانی کے علاوہ حیات کی برہنہ مگر جمالیاتی تفسیر بھی ہے۔ ہر وہ بات جو سب کی سمجھ میں آ جائے، ترسیل کا ذریعہ تو بن سکتی ہے مگر شاعری نہیں بن سکتی۔ شاعری تخیل کی ایسی زبان اور لاشعور کی ایسی صوت و صدا ہے یا یوں کہیے کہ وجدان کی ایسی سرشاری ہے جسے شعور اپنے تمام تر فنی بصیرت و احتیاط کے ساتھ لفظوں کے آبگینوں میں یوں سجانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی مشابہ صورت رو پذیر ہو جائے۔ یہ مشابہ صورت اپنے پیکر میں تشابہات کی کثرت آرائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ اسی صریر خامہ کو غالب نے "نوائے سروش" اور انہیں آبگینوں کو 'گنجینہ معنی کا طلسم' کہا ہے۔" [2]

مذکورہ بالا سطور میں صدیق مجیبی نے تصور شاعری کی اس قدر جامع وضاحت کی ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ صدیق مجیبی کے نزدیک شاعری زندگی کو بصیرت افروز بنانے کا وسیلہ بھی ہے اور حسی تجربوں کی جمالیاتی تفسیر بھی۔ اسی کا ثمرہ ہے کہ مجیبی کی شعری جمالیات بنیادی طور پر انفرادی احساسات و تجربات کی ہے۔ ان کی آواز اپنے تجربے کی آواز ہے جس کی گونج نہ صرف ذہنوں کو جھنجھوڑتی ہے بلکہ قاری کی دنیا کو بھی تہہ و بالا کر دیتی ہے۔ ان کی غزلوں میں عصری حسیت کا التہاب بھی ہے اور تعمق بھی۔ مجیبی نے مطالبات زندگی سے مختلف موقعوں پر نبرد آزما ہو کر زندگی کا سراغ پانے کی کوشش کی ہے اور حتی المقدور اس میں کامیاب بھی رہے۔ اپنے عہد کی تمام خوفناکیوں، سفاکیوں نیز تہذیبی و ثقافتی اقدار کی شکست و ریخت نے نہ صرف مجیبی کے ذہن کو متاثر کیا بلکہ ان کے پورے وجود کو ہلا کر ایک جذباتی

اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔خود کہتے ہیں:

سب پوچھتے ہیں مجھ سے مجیبی بتاؤں کیا
ویران شاخ شاخ شجر کیسے ہو گیا

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مجیبی کی شاعری میں ذات کے کرب کا شدید احساس ہے لیکن اس کرب کو جھیلنے کا اس میں ہمت بھی ہے اور حوصلہ بھی شعر میں لہجے کا جو تیور ہے فکر و احساس کا جو آہنگ و اعتماد ہے وہ مجیبی کے مزاج کی قلندرانہ صفت کا آئینہ دار ہے مجیبی نے حالات اور ماحول کے تعلق سے جا بجا اپنی بے اطمینانی اور ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ان کی غزلوں کے مطالعے سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ صدیق مجیبی کی شاعری احساس کی صداقت، تخیل کی نزاکت اور شخصیت کی پرخلوص آنچ سے مزین ہے۔غم و اندوہ میں بھی وہ حوصلہ نہیں ہارتے بلکہ رجائیت اور مایوسی کے امتزاج سے امید اور جدو جہد کا رویہ رکھتے ہیں۔گرد و پیش کی حقیقتیں ان کے احساس کو مجروح ضرور کرتی ہیں لیکن ان کے یہاں کوئی ہیجان نظر نہیں آتا بلکہ ان کے احساسات و خیالات کی سطح پر سکون نظر آتا ہے جو ہمیں غور و فکر پر اکساتا ہے۔مجیبی کی شاعری کا غالب عنصر جذبات و احساسات کی شدت ہے اور یہی ان کی شاعری کی اساس بھی ہے۔خود کہتے ہیں۔

لفظوں سے بھی ہر بات مجیبی نہیں بنتی
احساس ہے وہ تیر جو پہنچا نہ کماں تک

اس شعر میں جذبات کا ایک طوفان، ایک ہیجان ایک بے چینی تو ہے لیکن فنکار مضمحل اور پریشان نہیں۔دوسرے مصرع میں احساس ہے وہ تیر جو پہنچا نہ کماں تک، میں لہجے کی شاعرانہ دلکشی شاعری کی شعریت اور طہارت کو نقصان پہنچنے نہیں دیتی۔آیئے اب ایسے اشعار کا سراغ لگایا جائے جن میں مجیبی نے میکانکی زندگی کے کرب کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے جس کے نتیجے میں ان کے یہاں ہم عصر زندگی کے بے کشش ہونے نیز فرد کی آرزوؤں، امیدوں اور اس کے خوابوں کے ڈھیر ہو جانے کا فنکارانہ اور شاعرانہ بیان ملتا ہے۔دیکھئے یہ اشعار:۔

کرتی ہے عجب طنز مرے صبر پہ امید
سوکھی ہوئی شاخوں میں ثمر باندھ رہی ہے

—

نیند آتی ہے تو ایک خوف سا لگتا ہے مجھے
جیسے اک لاش پہ ہو چیل اترنے والی

—

چھتیں آلام کی دیوار و در سب بے یقینی کے
ہمارے روز و شب کہتے ہیں شانوں پہ وطن رکھنا

—

ہر زخم بر زبان رفو بولنے لگا
میں چپ رہا تو میرا لہو بولنے لگا

—

مرے لہو کی تمام گلیوں میں آگ روشن
جو میرے بس میں تھا کر دیا وہ کمال کیسا

ان اشعار میں انسانی زندگی کی محرومیاں بھی ہیں اور بے چارگیاں بھی پہلے شعر میں عرفان ذات کی حسیت کو بڑی شدت سے ابھارا گیا ہے۔دوسرے شعر میں ماحول کی بے پناہ اذیت نے فنکار کے حساس ضمیر کو جھنجھوڑ دیا ہے۔''ایک خوف سا لگتا ہے مجھے'' نے حالات اور کوائف کی پوری تصویر کو مقید کر رکھا ہے جو ایک مخصوص اضطراری کیفیت کا اشاریہ بن گیا ہے۔اس کیفیت کو دوسرا مصرع ''جیسے اک لاش پہ ہو چیل اترنے والی'' جو تقویت بخشتا ہے۔تیسرے شعر میں رنج و آلام کا بیان تو ہے لیکن غم و اندوہ کا واویلا نہیں بلکہ ان کے ارتفاع یعنی Sublimation کا حوصلہ نظر آتا ہے۔شعر کا دوسرا مصرع ''ہمارے روز و شب کہتے ہیں شانوں پر وطن رکھنا'' میں ہزیمت و پسپائی نہیں بلکہ جرأت و استقلال، پامردی و شکیبائی اس سے بھی بڑھ کر امنگ اور حوصلہ مندی اور ارتکاز قوت کا آئینہ دار ہے۔چوتھے شعر میں عصر نو کی دھڑکنیں شامل ہیں جو شاعر کے عصری شعور کا ترجمان بن گیا ہے۔شعر کے دوسرے مصرع میں 'لہو' جوش عمل کی علامت ہے۔پانچویں شعر میں بھی تقریباً یہی کیفیت ہے۔صدیق مجیبی کی شاعری کے لہجے میں امید اور رجائیت ہے۔وہ محض وارداتِ قلب کے شاعر نہیں بلکہ مشاہدات وقت و حالات کے عکاس بھی ہیں۔

موضوعات:

صدیق مجیبی کی غزلیہ شاعری کے موضوعات عصری زندگی کے مانوس وموجود تلخ حقائق ہیں جن کی تشکیل میں زندگی کا دکھ، ماحول کا جبر اور عہد کا کرب کا کلیدی رول ہے۔ ہم عصر زندگی میں جبر وتشدد جس طرح انسانی روح کو ظلمت آشنا کر رہا ہے سیاست کی شعبدہ بازی، فاشسٹزم نظام کا ظلم وتشدد، فرقہ وارانہ فساد، آمریت و ناانصافی، یقین و بے یقینی کی کشمکش، لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورتِ حال جیسے ان گنت معاملات و مسائل ہیں جن کا ردعمل مجیبی کے درون میں اضطراب پیدا کرتا ہے۔ ان تمام مشاہدات اور سانحات کو جذبے اور محسوسات میں ڈھال کر لطیف اشاروں سے پیش کرنا مجیبی کا حصہ ہے۔ دیکھیے یہ اشعار:

مرے چہرے سے غم آنکھوں سے حیرانی نہ جائے گی
یہی صورت رہے گی اور پہچانی نہ جائے گی
تمہارا جھوٹ میرے سچ کا قاتل ہے مگر دنیا
تمہاری مان جائے گی مری مانی نہ جائے گی
قلم دل میں ڈبو کر بھی مجیبی کچھ نہ ہاتھ آیا
یہ وہ احساس ہے جس کی پشیمانی نہ جائے گی

—

یہاں ہر راستہ مقتل ہے ہر مقتل تماشہ ہے
یہ اپنا شہر ہے اس شہر کا ثانی نہ پاؤ گے

—

مسیح وقت اب آئے تو بس خدا آئے
پیمبروں کی زمیں اور عتاب چاروں طرف

—

جانے انجام مجیبی کیا ہو
رات بھر دل کی زمیں ڈولتی ہے

—

رات بھر قتل ہوا شہر میں میرے لیکن
کوئی دھبہ بھی کہیں دن کے اجالوں میں نہ تھا

یہ تمام اشعار فنکار کے احساسات وکیفیات کو تہہ بہ تہہ کریدتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ساتھ ہی شاعر کے مفکرانہ لب ولہجہ اور واردات قلبی کے انعکاس بھی ہیں۔ درد وغم کا عنصر جس طرح ایک مرکز پہ سمٹ آیا ہے وہ ان اشعار کو دوامی قدروں کا حامل بناتا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

''صدیق مجیبی کے اشعار دل سے نکلتے ہیں اور دلوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بناؤ سنگار کم ہے۔ آمد اور بے ساختگی کی کیفیت زیادہ ہے۔ انداز بیان ایسا کہ دل سے نکلتا ہے اور دل میں کھپ جاتا ہے۔ ان کے بعض اشعار کی کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ مدتوں تک پیچھا کرتے ہیں اور ذہن ودل پر اس طرح نقش ہو جاتے ہیں کہ شعور و لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ان کے تمام اشعار کے بارے میں کوئی حلفیہ بیان دینا تو دشوار ہے مگر چند ایسے اشعار ضرور ہیں جو پچھلے بیس برس کے لگ بھگ کم سے کم میرے ذہن پر نقش ہیں۔ زمانے کا حساب لگایا نہیں مگر کم وبیش اتنا زمانہ ہوا ہوگا جب رانچی میں میں نے ان کی زبانی یہ اشعار سنے تھے اور ان کی بوقلمونی، رنگا رنگی اور ہمہ جہتی کا قائل ہوا تھا۔ ان کے کلام میں حسنِ ادا بھی ہے اور جرأت فکر بھی۔''

مجھے بھی دیکھ مرے حوصلے بھی دیکھ ذرا
مرا تو کوئی نہیں تو نہیں، خدا بھی نہیں

یہ خود اعتماد اپنی کیفیات میں ڈوب کر شعر کہنے کا یہ انداز صدیق مجیبی کی پہچان ہے اور ان کے پڑھنے والوں اور مداحوں کے لیے نشاط کا سامان بھی۔'' [3]

اس میں کوئی شک نہیں کہ صدیق مجیبی کی شاعری میں نئے طرزِ احساس کی شدت، تجربات کی پہلوداری کے ساتھ زیادہ پر اثرات صورت میں سامنے آتی ہے۔ مجیبی اپنے ذہنی سکون اور توازن کو طنزیہ رویے سے بھی استحکام بخشتے ہیں جو ان کی متحمل مزاجی کی ایک نئی جہت کو روشن کرتا ہے۔ میں یہاں چند اشعار نقل کرنا چاہوں گا جو فنکار کی ذہنی بلوغت اور ہمہ گیری کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

میں نے ہنسنے کی اذیت جھیل لی رویا نہیں
یہ سلیقہ بھی کوئی آسان جینے کا نہ تھا

—

یہ کیسا شہر ہے کیسی ہے سر زمیں اس کی
جہاں کی خاک پلٹتا ہوں سر نکلتا ہے

—

یا رب ہوائے وقت سے دستار کیا گری
اک نا تراش بھی مجھے تو بولنے لگا

—

یہ دنیا دار چہرے بھی بڑے دیندار لگتے ہیں
تماشا گاہِ عالم میں سبھی فنکار لگتے ہیں

—

ان اشعار میں مجیبی نے المناک کیفیات کو تخلیقی تجربے کا جس طرح حصہ بنایا ہے، اس کے توسط سے اس عہد پر جو عذاب مسلط ہے، اس کا گہرا شعور ہمیں عطا کرتا ہے۔ حالاتِ زندگی نے مجیبی کو مضمحل ضرور کیا ہے لیکن کرب و اضطراب کے اظہار میں جھنجھلاہٹ نہیں بلکہ جذبے کی صداقت کو دخل ہے۔

مصلحت آمیز منفعت کو صداقت پر ترجیح دینے کا رجحان دن بہ دن زور پکڑتا جا رہا ہے۔ تبدیلیوں کے اس دور میں حاشیہ برداری، ضمیر فروشی اور مصلحت پسندی کو ہی شہرت، مقبولیت اور دولت کمانے کا زینہ تصور کیا جا رہا ہے۔ مجیبی کی شخصیت کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ ان کی ذات میں مصلحت اندیشی ہے نہ تصنع، نہ ریا کاری۔ ان کی روشن ضمیری اور اعلیٰ ظرفی کی دلیل یہ ہے کہ کبھی بھی حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ کبھی اپنے اصولوں کا سودا کرتے ہیں۔ ان کے مزاج کی قلندری و درویشی سبھوں کو خوش کرنے کی منافقت سے مبرا ہے۔ دیکھئے یہ اشعار:

سب کی پسند کا ہو وہ کردار میں نہیں
ویسا ہی میں ہوں جیسا مجھے ہونا چاہیے

—

اک ٹوٹا ہوا دل ہے مرے پاس مجیبیؔ
بک جائے تو اس کو سر بازار بھی لے جا

—

محبت کے بدلے محبت نہ مانگ
کہ یہ مسئلہ کاروباری نہ رکھ

—

ڈھونڈ لیتی ہے برے لوگوں میں بھی وصف کوئی
بس یہی عیب مجیبیؔ مری بینائی میں ہے

—

چہرہ ثابت ہے نہ پندار سلامت اب کے
سر خرو ہو گیا ہر سنگ ملامت اب کے

—

ان اشعار میں مجیبی کی جرأت گفتار قابل ستائش ہے جو دراصل صلابتِ کردار کا ہی ایک روپ ہے۔ ان میں طنزیہ رنگ بھی نمایاں ہے اور خطابیہ لہجہ بھی ہر شعر فنکار کے جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ زندگی کے بعض بنیادی حقائق سے ہم آغوش ہو جاتا ہے جو شاعر کی فکری بصیرت پر دال ہے۔ مجیبی نے ان اشعار میں اپنی ذات کو موضوع بنایا ہے جو زندگی کے سنجیدہ مسائل سے دوچار ہے۔ مجیبی کی شاعری میں عصری حقائق کو مختلف زاویوں سے نمایاں کیا گیا ہے جو ان کے توانا افکار اور تخیل کی بلند پروازی کی ضامن ہیں۔ ان کی غزلوں کو پڑھ کر ہمیں ایک نئی فضا اور ایک نئے ذائقے کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں خود کلامی، کہیں انکشافِ ذات، کبھی خود آگہی کو تخلیقی تجربے کا حصہ بنایا گیا ہے۔

عصری حسیت:

عصری آگہی جب غزل کے اشعار کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو حسین دکھائی دینے لگتے ہیں۔ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ مجیبی کا فکری وفنی اختصاص یہ بھی ہے کہ اپنے عہد کی زندگی کی تلخیوں کا اظہار اپنے خاص تیور میں کرتے ہیں۔ اپنے عہد کا انتشار ہی ان کا شعری کائنات ہے اور تخلیق کا جوہر بھی۔ گجرات فساد کے تناظر میں انھوں نے دانشوری اور صنعت گری Intellactualism & Craftmanship کے عناصر نمایاں ہیں اور فنکار کی کچلی ہوئی مجروح لیکن متحرک وحساس شخصیت کا اظہار بھی پایا جاتا ہے۔ اسے ہم مجیبی کے داخلی کرب کا بھی نام دے سکتے ہیں۔ ایسے اشعار میں رمزیت، اشاریت اور ایمائیت پوری حرارت اور حرکت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان اشعار میں تفکر بھی ہے اور تحیر بھی، تخیل بھی ہے اور تصور بھی۔ مجیبی کی جدت طراز ذہن کی تخلیقی فعالیت نے جو ترکیبیں وضع کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ دیکھیے یہ اشعار:

مہندی بھی جلی ساتھ مکینوں کے مجیبی
ہم سائے میں تلسی کے بچے رہ گئے پتے

—

منصف نے عجب چال چلی مات ہوئے سب
ہاتھوں میں دھرے کے ہی دھرے رہ گئے پتے

—

جس طرح سے پامال ہوئے چاند سے چہرے
یوں روند کے لاشوں کو قضا بھی نہیں چلتی

—

میں سمجھتا تھا جسے تریاق غم تسکین جاں
میری بربادی میں شاید ہاتھ اب اس کا بھی ہے

—

اپنے پاس بچا ہی کیا ہے یار مجیبی لیکن
قاتل کے دامن لہو کے چھینٹوں سے بھر جاؤں

—

شہر میں کچھ لوگ قاتل ہیں تو کچھ منصف بھی ہیں
دوستوں نے اس یقیں کو بھی کہاں رہنے دیا

—

مذکورہ بالا اشعار فنکار کے ایک نمایاں وصف راست اظہار کے آئینہ دار ہیں پہلے شعر میں 'مہندی' اور 'تلسی' کے استعاروں کو احساس و کیفیت سے ہم آہنگ کر کے شعر میں ڈھالا گیا ہے۔ ان میں عصری حسیت کے ساتھ ساتھ تخلیقی وفور وشعور کا تنوع ہم دیکھ سکتے ہیں تیسرے شعر کے دوسرے مصرع ''یوں روند کے لاشوں کو قضا بھی نہیں چلتی'' میں ایک حیرانی و ویرانی، بے یقینی کا ماحول پوری شعری فضا پر چھایا ہوا ہے جو اشاریہ ہے ظلم و بربریت کا۔ تیسرے شعر میں آدمی کے دوغلا پن کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آج کل کا انسان مکھوٹے پہنے ہوا ہے اور اس کی پہچان کرنی مشکل ہے۔ ''جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے'' کے مصداق فنکار کو شدت سے احساس بلکہ یقین ہے کہ ''میری بربادی میں شاید ہاتھ اس کا بھی ہے''۔ میں جو کرب ہے، فنکار کے مفکرانہ ذہن کا حامل ہے۔ یہ شعر مجیبی کی فکر انگیز، درد انگیز، روح کو جھنجھوڑتی ہوئی حقیقت سے آشنا کراتا ہے۔ چوتھے اور پانچویں شعر میں فنکار کی بے چینی اور اضطراب کا عنصر صاف طور پر نمایاں ہے۔ چوتھے شعر کے دوسرے مصرع ''قاتل کے دامن لہو کے چھینٹوں سے بھر جاؤں'' اور پانچویں شعر کے دوسرے مصرع ''دوستوں نے اس یقیں کو بھی کہاں رہنے دیا'' میں فنکار کی شاعری غور وفکر میں مستغرق اور اضطراب وانتشار میں محو دکھائی دیتی ہے جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ صدیق مجیبی اپنے عہد کے حالات و واقعات اور رونما ہونے والے حادثات شعری اظہار کے وسیلے سے اجاگر کرنے کا ہنر جانتے ہیں مذکورہ اشعار میں طنز بھی ہے تلخی بھی ہے، تحرک بھی ہے اور کسی حد تک احتجاج بھی۔ لیکن ان میں نہ تو اپنے معاشرے سے گلوخلاصی کا پیغام ہے اور نہ ہی مردم بیزاری کی تلقین بلکہ تہذیبی تشخص کو جس طرح پامال کیا جارہا ہے اس حقیقت کو شائستگی اور سچائی کے ساتھ تخلیقی انفرادیت کا وصف عطا کر کے شاعری کے پیکر میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں کہ ان کی عصری شاعری کی معنویت سے قاری مکمل طور پر آشنا ہو سکے۔

اس ضمن میں چند اشعار مزید ملاحظہ ہوں۔

سوائے سچ کے کیا کہوں، جو سچ نہیں تو کیا کہوں
کہو تو زباں تراش لوں کہو تو آنکھ پھوڑ لوں

—

لہو میں احتجاج کی بہت ہے گونج ان دنوں
منافقوں کے درمیاں ہوں کس سے مشورہ کروں

—

ہم جلائیں اپنے دل کو تم جلاؤ سب کے گھر
تنہا ممکن بھی نہیں ساری فضا روشن کریں

—

مجیبیؔ کیسے یقیں آئے ''خیر'' زندہ ہے
وہ ایک جگنو سہی گھر جلا کے رکھ تو دیا

—

ان اشعار میں معاشرتی زندگی کے زوال اور اخلاقی شکستگی کے اظہار میں فنکار کے ملتہب دل میں جو انتشار اور اضطراب ہے، قاری کے ذہن کو آتشیں بنا دیتا ہے۔ طنز و نشتریت کے اسی لہجے نے صدیق مجیبی کو اپنے معاصر فنکاروں میں شعری منظر نامے کے حوالے سے منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے۔ انھوں نے زندگی کی اذیت ناکی کے سچویشن کا مشاہدہ بہت ہی قریب سے کیا ہے۔ اس کے بعد یہی شعری اور تخلیقی وجدان کا حصہ بنایا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے اور جھیلتے ہیں اس کا بیان پورے خلوص و اعتقاد، فنی حسن اور فکری بالیدگی کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری میں عرفانِ ذات بھی ہے اور اجتماعی وجود کا ادراک بھی۔ وہ اپنے عہد کی سچائیوں، تلخیوں کے اظہار سے کنارہ کشی اختیار نہیں بلکہ اس کے اظہار کے وسیلے سے اپنی تخلیقی شناخت قائم کی ہے۔

صدیق مجیبی کی شاعری میں عشقیہ جذبات و کیفیات کی آئینہ داری:

اردو غزل اپنے ابتدائی دور سے ہی عشقیہ جذبات، احساسات و تجربات کا آئینہ دار رہی ہے۔ تقریباً تمام شعراء نے اپنی غزلوں میں حسن و عشق کی داستان سرائی معشوق سے محو گفتگو، پیکرِ حسن کی تعریف، ہجر و فراق کی تڑپ، وصالِ محبوب کی تمنا، وصلِ محبوب کی لذت آرائی کا ذکر کسی نہ کسی طور پر کیا ہے اور یہ ہماری شعری روایت کا ایک اہم حصہ ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ کلاسیکی شعرا کے یہاں جو عشق کا تصور اور عشق کی کارفرمائیاں تھیں اب جدید عہد میں قصہ پارینہ ہوگئی ہیں، مثالی عشق اور عاشق کا تصور ناپید ہو چکا ہے۔ آج کے عہد میں اردو شاعری کے محبوب کے رویے میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ آج کا محبوب شہری تمدن اور انتشار و افراتفری کی بھیڑ میں اگر گم ہوگیا تو اس کا ڈھونڈ پانا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد جدید کا عاشق اپنے محبوب کے بچھڑ جانے پر کفِ افسوس نہیں ملتا۔ ٹسوئے نہیں بہاتا، آہ و گریہ و زاری نہیں کرتا بلکہ کسی دوسرے محبوب کی تلاش میں نکل جاتا ہے یا آہستہ آہستہ تنہائیوں کو اپنا رفیق اور غم گسار بنا لیتا ہے۔ اب نہ تو کلاسیکی غزل کی طرح عاشق ہجر کی کرب سے گذرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی وصل کی خواہش اسے ستاتی ہے۔ کلاسیکی غزل میں عشق کے اظہار میں جو جذبات و احساسات تھے جدید عہد میں ان میں تبدیلی کا رجحان مختلف صورتوں میں ہوا ہے۔ ادب میں تانیثیت کے رجحان نے عورتوں کو خود مختار بنا دیا ہے۔ جنسی رجحان کو شاعری میں نمایاں جگہ ملی ہے۔ جسم کے تقاضوں پر بھی کھلے طور پر اظہار ہو رہا ہے بلکہ اس کو مثبت رجحان گردانا جا رہا ہے۔ آج کا محبوب محض Time Pass کی ضرورت بن کر رہ گیا ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

> ''داخلی اور معنوی حسیت سے میں ایسی شاعری کو جدید سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم، خوف، تنہائی، کیفیت انتشار اور اس بے چینی کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار کرتی ہو جو جدید صنعتی اور مشینی اور میکانیکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوشحالی، ذہنی کھوکھلے پن، روحانی دیوالیہ پن اور احساس بے چارگی کا عطیہ ہے۔ جدید ادب گرتی ہوئی چھتوں، لڑکھڑاتے ہوئے سہاروں اور لاتعداد بھول بھلیوں کے خوفناک احساس گم کردہ راہی سے عبارت ہے۔'' 4

شمس الرحمٰن فاروقی کی مذکورہ عبارت سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ جدید غزلوں

میں کلاسیکی اصطلاحوں کی معنویت معدوم ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں آج کی شاعری کے لیے عصری زندگی کے لاتعداد تجربوں میں شمولیت اورادراک واحساس بہت ضروری ہے۔عشقیہ جذبات واحساسات کی تفہیم وتعین قدر کے سلسلے میں بھی ماضی کی فرسودہ کسوٹی مثلاً عشق حقیقی ،عشق مجازی، ہوسنا کی، معاملہ بندی، غم جاناں، غم دوراں وغیرہ پر پرکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی بلکہ اسے انسانی زندگی اوراس کے ماحول کے رشتوں اور رابطوں کے حوالے سے نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔عصر حاضر میں عشق کی نوعیت کے ساتھ ساتھ عاشق کے مزاج میں بھی یکسر تبدیلی آچکی ہے۔آج کا عاشق غالب کی طرح منت و سماجت نہیں کرتا۔

ترک کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

آج کا عاشق ''چتّی جان نہ سہی منی جان سہی'' کے تحت عشق کو ترک کرنے میں کسی طرح کی ندامت یا قباحت محسوس نہیں کرتا۔صدیق مجیبی کی شاعری میں عشق کے جذبات، کیفیات واردات کا اظہار مختلف رنگ میں پوری آب وتاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔وہ پڑھنے والے کو سرشاریٔ محبت کی ایسی مسحورکن کیفیات سے ہمکنار کرتے ہیں کہ پڑھتے ہوئے خاصا لطف آتا ہے۔ان کے یہاں عشق کا اپنا ایک تصور ہے جوان کی جرأت اور دلیری کی ضامن ہے۔دیکھئے یہ اشعار۔

عشق میں دشمن و احباب نہیں دیکھتے ہم
موج میں رہتے ہیں گرداب نہیں دیکھتے ہم

—

خرابِ عشق میں دنیا کے پیچ وخم سمجھتے ہیں
ہمیں سادہ نہ جانو ہم بھی بیش وکم سمجھتے ہیں

—

محبت میں شکست و فتح بس ایک بار ہوتی ہے
مجیبؔی عشق کا یہ معرکہ پیہم نہیں ہوتا

—

عشق سودا ہے رعایت بھی نہیں چاہتے ہم
تیری جانب سے محبت بھی نہیں چاہتے ہم

—

نیرنگ جہاں ایک تماشہ ہے تو کیا ہے
گرعشق بھی ایک آگ کا دریا ہے تو کیا ہے

—

دل کو مرغوب ہوا تیرے بدن کا آہنگ
ورنہ عاشق تیرے پائل کے نہ جھنکار کے ہیں

—

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں قطعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عشق کی عظمت کو صدیق مجیبی بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ پہلے شعر کا دوسرا مصرع ''موج میں رہتے ہیں گرداب نہیں دیکھتے ہم'' فنکار کے احساس درون کا آئینہ دار ہے۔عشق کی کیفیت کا اظہار مجیبی نے جس صداقت سے کیا ہے اور اپنے خلوص اور وفا کو جولب ولہجہ عطا کیا ہے اس کے لئے کسی سے شہادت یا سند لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔دوسرا شعر بھی فنکار کے شعور کی پختگی اور جذب صادق کا غماز ہے۔مجیبی غزل کے شاعر ہیں۔واردات قلب کے اظہار میں کسی قسم کی پس وپیش نہیں کرتے۔شعر کا Tone ''ہمیں سادہ نہ جانو ہم بھی بیش وکم سمجھتے ہیں'' فنکار کے احتساب خود پر دلالت کرتا ہے اوراس میں خودتحکمی کا عنصر بھی شامل ہے۔دل گرفتگی کے باوجوداس میں ایک طرح کی طمانیت خود (Self Composedness) اوروزن ووقار کا بھی احساس ہوتا ہے۔تیسرے شعر میں محبت کے فلسفہ کو پیش کیا گیا ہے جس میں سود وزیاں، شکست وفتح عارضی ہیں اوراس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔چوتھا شعر فنکار کے احساسات کا سچا اور کھرا بیان ہے لیکن اس میں کسی قسم کی آلودگی نہیں۔لہجے میں احساس کی شدت ضرور ہے لیکن نہ تصنع ہے نہ ریاکاری۔بلکہ مزاج کی قلندری اور درویشی ہے۔'' تیری جانب سے محبت بھی نہیں چاہتے ہم'' فنکار کی روشن ضمیری اور اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے۔صدیق مجیبی کائنات کی ہر شے سے متعلق اپنا ایک الگ زاویۂ نظر قائم کرتے ہیں۔پانچویں شعر میں جس جرأت اور بے باکی سے روایت سے انحراف کرتے ہوئے عشق کاری کے زخم کھانے اور آگ میں کودنے کو دیوانگی کی حد

تک ضروری سمجھتے ہیں۔اس سلسلے میں صدیق مجیبی کے چند اور اشعار پیش کرتا ہوں۔

خرابِ عشق کو خدا عذاب دے رہا ہے یوں
جہاں مقام دل کا تھا وہاں دماغ رکھ دیا

—

اپنا سمجھ کے تم کو دیا ہے یہ مشورہ
عشق ایسا کام ہے کہ خدا کا بھی ڈر نہیں

—

نہ جانے کس طرح پرکھ لیتا ہے دیوانوں کو
عشق کے ہاتھ میں دیکھی نہیں میزان کبھی

—

خوف گناہ ،کرمک شب تاب راہِ شوق
لغزش قدم قدم پہ عطائے شباب ہے

—

عشق وہ بحر مجیبیؔ ہے کہ دیکھا ہم نے
خاروخس پاک ہوئے اہلِ یقیں ڈوبتے ہیں

—

جو خاک ہوئے عشق میں وہ مر نہیں جاتے
یہ نقش تو ہر نقشِ زمانی سے الگ ہے

—

آداب محبت کے ہیں کچھ اور تقاضے
اور دل کو سنبھالے سے سنبھالے میں نہ آئے

—

یہ تمام اشعار میرے اس خیال کی تائید کر رہے ہیں کہ صدیق مجیبی شاعری کے توسط سے عشقیہ تجربات کا مفکرانہ تجربہ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان اشعار کی معنیٰ خیزی پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔مشاہدے اور تخیل کی فراوانی،خیالات کے تنوع،احساس کی شدت اور موضوع کی ندرت نے ان کی عشقیہ شاعری کو بہت وزنی بنا دیا ہے۔ان اشعار میں تہذیب بھی ہے،وزن بھی اور ٹھہراؤ بھی۔یہ اشعار نہ وفاداری سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ بے وفائی سے۔پھر بھی حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ان میں وہی کیفیتیں ہیں جو جدید شاعری کی شناخت ہے اور جن سے آج کا شاعر دوچار ہے۔ان اشعار میں داخلیت اور خارجیت کی حدیں ختم ہوگئی ہیں۔تغزل کا لفظی حصار بھی ٹوٹتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ صدیق مجیبی کی غزلوں میں عشقیہ جذبات و احساسات و کیفیات کا اظہار اپنے زمانے کی روح سے ہم آہنگ ہے اور جن میں ایک نوع کی تازگی بھی ہے،جرأت اور راست کرداری بھی۔یہ سب ایسے جوہر ہیں جن سے کیف اور بصیرت حاصل کی جاتی رہے گی۔

صدیق مجیبی کی شاعری میں انانیت :

مولانا ابوالکلام آزاد نے ''غبارِ خاطر'' کے خط نمبر 17 میں ''انانیت'' (Egoism) پر تفصیلی بحث کی ہے۔اس سلسلے میں ''انانیت'' کے متعلق ایک سوال کھڑا کیا ہے:۔

> '' آیئے آج تھوڑی دیر رک کر اس معاملے پر غور کرلیں۔ایک ادیب،ایک شاعر،ایک مصور،ایک اہل قلم کی انانیت (Egoism) کیا ہے؟ ابھی نہ تو فلسفۂ اخلاق کے مذہب انا (Egoism) کا رخ کیجئے نہ خودی مصطلحۂ تصوف میں جایئے۔صرف ایک عام تخیلی زاویۂ نگاہ سے معاملہ کو دیکھئے۔آپ کو صاف دکھائی دے گا کہ یہ انانیت دراصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس کی فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے جسے وہ دبا نہیں سکتا۔اگر دبانا چاہتا ہے تو اور زیادہ ابھرنے لگتی ہے اور اپنی ہستی کا اثبات کرتی ہے۔'' 5

مذکورہ قول کے پیشِ نظر جب ہم صدیق مجیبی کی شاعری میں ''انانیت'' کے پہلو تلاش کرتے ہیں تو اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان کے یہاں انانیت کسی فلسفے کا پیداوار نہیں بلکہ ان کی خود بینی،خود شناسی کے علاوہ ان کی مفکرانہ بصیرت اور بلندئ فکر و نظر کا زائیدہ ہے۔وہ حد درجہ حساس شاعر ہیں۔انہوں نے

تقسیم ہند کی لعنتوں کا بھی مشاہدہ کیا۔ سیاست کی شعبدہ بازیاں بھی دیکھیں۔ فرقہ وارانہ فسادات میں خون کی ندیاں اور انسانیت کو شرمسار کر دینے والے مناظر بھی دیکھے۔ لوگوں کو ترک وطن کرتے ہوئے ان کے چہروں کی افسردگی اور بے بسی بھی دیکھی۔ انسان کا جب کسی سے یا واقعہ پر زور نہیں چلتا تو اس کے مزاج میں تلخی اور انانیت اور لہجہ میں طنز پیدا ہو جاتا ہے۔ صدیق مجیبی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ انہوں نے انانیت کا اظہار اپنی ذات کے عرفان کے حوالے سے کیا ہے۔ طاقت و جبروت کے خلاف ان کی انانیتی شاعری ایک ایسی آواز ہے جو ان کے دل سے نکلتی ہے جس میں عصری زندگی کے انتشار کا گلہ بھی ہے اور خود کو بلند و بالا رکھنے کا حوصلہ بھی۔ ایسے اشعار کے تیور میں بیباکی بھی ہے اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا طمطراق بھی جس کی گونج نہ صرف ذہنوں کو جھنجھوڑتی ہے بلکہ فنکار کی متحرک و حساس شخصیت اور داخلی کرب کو بڑی تمکنت اور پرشکوہ انداز میں آشکارا کر دیتی ہے۔ اپنی باتوں کو تقویت بخشنے کے لئے چند اشعار پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

سب کی پسند کا ہو وہ کردار میں نہیں
ویسا ہی میں ہوں جیسا مجھے ہونا چاہئے

—

میرا نہ کوئی نام نہ منصب ہے نہ مصرف
کجلائی ہوئی شام کے چہرے کا دھواں ہوں

—

اپنا سرکاٹ کے نیزے پہ اٹھائے رکھا
صرف یہ ضد کہ میرا سر ہے تو اونچا ہوگا

—

نہ کھائی مات نہ دشمن سے صلح کی میں نے
یہی بساط میری ہے یہی ہنر میرا

—

افسانۂ دل ختم ہوا مرگ انا پر
اے دستِ اجل لے مرا شہکار بھی لے جا

—

غبارِ راہ ہوں لیکن انا اتنی تو رکھتا ہوں
قدم رکھا تو ہر نقش کفِ پا سے جدا رکھا

—

انا سر چڑھ گئی ہے اک بگولے کی طرح ایسی
کہ سر جائے گا اک دن خوئے عریانی نہ جائے گی

—

لرز کے پھینک دی قاتل نے ہاتھ سے تلوار
اٹھائے کون انی پر زمین سے سرمیرا

—

شاعری شخصیت کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے۔ صدیق مجیبی نے مذکورہ اشعار میں اپنی شخصیت کے جس پہلو کو نمایاں کیا ہے ان میں فکری انفرادیت اور انانیت کا ایک نغمہ گونج رہا ہے۔ انانیت کے اظہار میں بے ساختگی بھی ہے، آمد بھی اور فنکار کے جوش کی پیداوار بھی۔ یہ اشعار تکلفاً یا برائے شعر گفتن کے لئے نہیں کہے گئے ہیں بلکہ اب لہجہ فنکار کی بیدار انانیت کا اشاریہ بن گیا ہے جس کے وسیلے سے ہم مجیبی کی دانائے راز شخصیت، فکر و نظر کی بلندی اور ان کی خود بینی و خود شناس شخصیت کے جوہر سے آشنا ہو جاتے ہیں ان کی یہ انانیت ایک ایسا بیش قیمت ہیرا ہے جو اپنی تابانی اور درخشانی سے فنکار کی شخصیت کو باوقار بناتا ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ صدیق مجیبی نے اپنی شاعری میں آہنگ اور وقار قائم رکھنے کے لئے شعوری طور پر انانیت کا اظہار کیا جو ان کی فعال شخصیت، مفکرانہ بصیرت کی ضامن ہے جس میں توازن بھی ہے، جوش بھی، بے ساختگی بھی اور خود شناسی و نظم و ضبط بھی، یہ ایسا جوہر ہے جسے چھپا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ غالبؔ کہتے ہیں:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں غالبؔ کا ہے انداز بیان اور

داغؔ کا شعر ہے۔

اردو ہے جس کا نام ہم ہی جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

مجیبی کہتے ہیں۔

سب رونقیں مجیبی وحشی کے دم سے تھیں
اک وہ نہیں تو شہر میں ہو بولنے لگا

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مجیبی کی توجہ صرف اپنی ذات پر مرکوز ہے۔اس رجحان کو تعلّی سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔دیکھئے کچھ اور اشعار۔

تکلف سے مبرا ہے مجیبی حسنِ فن اپنا
کہ گل بوٹے کہاں مہتاب کی چادر میں رہتے ہیں

—

اس کے آگے تو ہمیں لوگ ہیں لطف الرحمٰن
کب سمندر کی تہوں میں کوئی زینہ اُترا

—

صدیق مجیبی کی شاعری میں تشکیک کا پہلو :

عالمی ادب میں خدا کے تصور اور خدا کی ذات سے انکار کرنے کا رجحان ملتا ہے۔کوئی بھی انسان جب کسی کے وجود سے انکار کرتا ہے تو وہ اس بات کا اشاریہ ہے کہ پہلے وہ اس کے وجود کا قائل ہو چکا ہوتا ہے اور تب جا کر اس کے وجود کی نفی کرتا ہے۔مغربی فلسفیوں نے خدا کے وجود پر سوالیہ نشان لگائے۔بقول پوپ ”خدا کی فکر میں نہ پڑو، اپنے آپ کو پہچانو، نسل انسانی کے لئے اصل موضوع خود انسان ہے۔

اس رجحان نے آگے چل کر مختلف قسم کے تصورات و نظریات کو جنم دیا۔کہیں ”خدا بیزاری (Theo Phobia) تو کبھی انفرادیت پسندی (Individualism) مثالیت پسندی (Idealism) نامیت (Organism) میکانزم، فطرت پرستی (Waliraism)، آزاد خیالی جیسے خیالات، نظریات تصورات و رجحانات ادب میں جگہ پانے لگے۔سترہویں صدی میں عقل پرستی کو ادب میں جگہ ملنی شروع

ہوئی جو اٹھارہویں صدی آتے آتے جذبہ و تخیل (Imagaism) کے رجحان میں تبدیل ہوگئی۔اس طرح تصورِ خدا میں بیش بہا تبدیلی رونما ہوتی رہی۔یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر میں جب مشہور مغربی فلسفی نیطشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا تو اس کے اعلان کردہ قول کی جانب جدید ذہن متوجہ ہوئے اور اس فکری باب میں سوچتے ہوئے خدا کی ذات کو رد و قبول کیا۔بیسویں صدی میں حسیات کے عمل سے اکتاہٹ کے ایسا احساس پیدا ہوا کہ لاشعور کی آواز بلند ہونے لگی جس کے نتیجے میں انسانی تعلقات کا ادب مر چکا ہے۔ایک دوسرے مغربی مفکر مالیرو نے 1945 میں حتمی اور قطعی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ انسان مر گیا۔غرض مغربی فلسفیوں نے کلاسیکی عہد سے ہی خدا کی ذات سے متعلق بے رخی کا اظہار کیا ہے۔وہ قسمت کے ظلم و ستم اور زندگی کی محرومی اور ناکامی کا ذمہ دار خدا کو تسلیم کرتے رہے۔جرمن فلاسفر شوپن ہارنے تو یہاں تک کہہ دیا:۔

”خدا ہے تو لیکن رحیم نہیں شریر ہے۔رحمٰن نہیں ظالم ہے، کردگار کا وجود ہو تو ہو، پروردگار کی ذرا کہیں نہیں ہے۔“

اردو شعر و ادب بھی اس سے مستثنٰی نہیں۔غالب کی مثال سامنے کی ہے جو کہتے ہیں۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
کیا ہم بھی یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔

جمیل مظہری غالبؔ کے اس شعر کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

یہ شعر مجھے بہت پسند ہے۔جب تنہا ہوتا ہوں تو اس کا پہلا مصرع گنگناتا رہتا ہوں اور ایمان کی بات پوچھئے تو جیت برابر مخلوق خدا میں اہرمن (شیطان) کی ہی ہو رہی ہے۔خالق خدا یعنی حضرت یزداں برابر شکستوں پر شکست کھا رہے ہیں۔“ 6

اردو کے نامور ادیبوں میں نیاز فتحپوری، مہدی افادی، سجاد انصاری کے یہاں بھی اس قسم کے تضاد اور تشکیک کا رجحان ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات تصور خدا کے سلسلے میں شدید ابہام میں مبتلا ہیں۔انہوں نے نہ تو کلی طور پر خدا کی ذات کو تسلیم کیا اور نہ ہی اس کی ذات سے انکار۔نیاز فتحپوری نے تو

1933 میں مذہب کی حمایت کو ہی مشکل ترین کام گردانا ہے۔لکھتے ہیں:۔

''اب زمانہ''یومنون بالغیب'' کا نہیں بلکہ ''یومنون بالتجربہ والشہود'' کا ہے
اور ایسے نازک وقت میں کسی شخص کا مذہب کی حمایت کے لئے کھڑا ہوجانا آسان کام
نہیں''

اب جمیل مظہری کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں تشکیک کا عنصر غالب ہے۔

سارے مرے جھگڑے ہیں جمیل اپنے خدا سے
منکر میں ائمہ کا نہ منکر ہوں نبی کا

—

وہ لاکھ چاہے سر کو جھکوا لے مرے گر یہ دل نہ اب کبھی جھکے گا
کبریائی سے بھی زیادہ مزاج نازک ہے بندگی کا

جدید شعراء نے خدا کو ایک وہم وگمان سے زیادہ نہیں گردانا۔ان کے عقیدے نہ صرف متزلزل دکھائی دیتے ہیں بلکہ وہ خدا کے وجود اور اس کے بخشش،اس کے ذریعہ چلائے جانے والے کائنات کے نظام کے بھی سرے سے منکر ہیں لہٰذا وہ خدا کی ذات کو اپنی شاعری میں طنز کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ پرانے مسلمات کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کا رجحان شروع ہوا اور اس طرح تشکیک پسندی کی ایک لہر اردو شاعری میں اٹھنے لگی۔نطشے نے خدا کی موت کا جو اعلان کیا تو اس کے زیر اثر اردو شاعروں نے بھی خدا کو مفلوج ومعطل گردانتے ہوئے خالق کے بجائے خدا کو ایک مخلوق کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کر دیا اور خدا کی حاکمیت،اس کے صفاتی تشخص،اسلام کے بنیادی تصور توحید،اسلامی عقائد،آخرت،جنت ودوزخ ،تقدیر وغیرہ جو بنیادی عقائد ہیں ان کو رد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔کفر والحاد کے اس تصور کو اردو شاعروں نے بغیر کسی خوف اور شرم وحیا کے اپنی شاعری میں فخریہ طور پر پیش کرنے لگے۔دیکھئے یہ اشعار۔

یا الٰہی تو اگر ہے تو ہو یدا ہوجا
اور نہیں ہے تو ابھی وقت ہے پیدا ہوجا
(شجاع خاور)

—

دل مطمئن ہے اس کی رضا کے بغیر بھی
ہر کام چل رہا ہے خدا کے بغیر بھی
(سلطان اختر)

—

کون جانے گا اب خدا اس کو
جس کی ہر بات آدمی سی ہے
(اقبال حیدر)

—

سویرے میری ان آنکھوں نے دیکھا
خدا چاروں طرف بکھرا پڑا ہے
(بشیر بدر)

—

راکشش تھا نہ خدا تھا پہلے
آدمی کتنا بڑا تھا پہلے
(ندا فاضلی)

—

قیامت کی دھمکی عذابوں کا ڈر ہے
ابھی تک خدا سے ہوا کچھ نہیں
(ارتضیٰ نشاط)

—

اگر دشوار ہوجائے خدائی
مجھے آواز دے لینا خدایا
(قیصر الجعفری)

—

یہ اشعار مثبت نمونہ از خردارے کے طور پر پیش کئے گئے ہیں جنہیں ہم تخلیقی اٹکھیلیاں سے موسوم کر سکتے ہیں۔ مذہبی عقائد اور دینی شعائر سے انحراف و انکار کفر و الحاد کی کلید ہے۔

یہ تمام اشعار فنکار کے ذہنی انتشار کے آئینہ دار ہیں اور نطشے کے نظریے کی توسیع۔ ایک نئے ویژن کے چکر میں الوہیت، ربوبیت، خدا کے وجود کو سرے سے ہی انکار کر کے مذہب اور اس کے متعلقات کو مسخ کر دیا گیا ہے ایسے تصورات و نظریات کے سرحدیں تشکیل اور کفر و الحاد سے جا ملتی ہے۔ یہ کوئی احسن فعل نہیں اور ایسی شاعری اخلاقی قدروں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک صدیق مجیبی کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے کہ انہیں زندگی میں سکون بہت کم میسر آیا۔ رفیقۂ حیات کا گذر جانا، کئی چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش، ملازمت کے لئے شہروں شہروں مارے پھرے چلنا، یہ وہ حالات و حادثات ہیں جن کے سبب مجیبی اضطراب و انتشار میں مبتلا رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یقین اور گماں کے درمیان معلق نظر آتے ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

میں کس یقیں پہ مجیبی پکارتا اس کو
نہ کوئی وصف نکو ہے نہ نیک خو میرے ساتھ

—

آ لوح و قلم لے کے خدا دشت گماں میں
سینے میں مرے دفترِ اسرار نو ا کھول

—

اچھا ہے کہ نہ یاد آئے کہ میرا بھی خدا تھا
ہونٹو پہ بہت تلخ بیاں ساتھ ہے میرے

—

خواب مسمار ہوئے سب میرے
ہاتھ اس میں بھی خدا کا کچھ ہے

—

حرف آئے گا تو آئے گا کرم پر اس کے
میرا کیا میں تو بہر حال گدا گر ٹھہرا

—

خدا نہیں وہ مجیبی تو پھر تاسف کیا
صنم کدہ ہوں سلامت تو مورتیں ہیں بہت

—

پھر موج بلا کیسے مرا سر لے گئی
اے خدا میرے خدا تو بھی نگہبانوں میں تھا

—

مجھے بھی دیکھ، میرے حوصلے بھی دیکھ ذرا
مرا تو کہیں نہیں تو نہیں خدا نہیں

—

میری دنیا فقط محتاج ہے میری رضا کی
خدا والوں یہاں میرا قرینہ چل رہا ہے

—

مجھ سے مت پوچھ کوئی مرا خدا ہے کہ نہیں
زندگی مجھ کو گنہگار بناتی کیوں ہے

—

ازل ابد ہے تو ہی لاالٰہ الا اللہ
تو پھر خلش مرے دل میں یہ پے بہ پے کیا ہے

—

یہ تمام اشعار صدیق مجیبی کے شعری مجموعہ ''شجر ممنوعہ'' سے جستہ جستہ نقل کئے گئے ہیں۔ ان اشعار میں تشکیکی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے جس میں زندگی کا کوئی منظّم و مرتب فلسفہ پیش نہیں کیا گیا ہے لیکن

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کھرے اور سچے شاعر ہیں۔ وہ کسی کو خوش کرنے یا داد حاصل کرنے کے لئے شعر نہیں کہے بلکہ اپنے فطری جذبات ونفسیات اور عصری حسیت کو بہت بے باکی سے پیش کرتے ہیں جس کو کہنے کی جرأت ہر کسی کو نہیں ہو سکتی۔ اپنے جذبات کے رو میں کبھی کبھی اس قدر بہہ جاتے ہیں کہ ان کی جذباتی بے چینی اور فکری ہیجان انہیں خدا بیزاری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ایسا اس لئے ہوا کہ جب انسان کا ذہن حالت سے نبرد آزما اور برسر پیکار ہونے میں خود کو ناکام محسوس کرتا ہے تو جذبات کی شوریدہ سری کائنات کی ہر شے سے متعلق اپنا ایک الگ زاویۂ نظر قائم کرنے لگتی ہے۔ فنکار کبھی یقین وگمان کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے کبھی بے یقینی کی وادیوں میں کھو جاتا ہے۔ صدیق مجیبی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ صدیق مجیبی کی تشکیک تخلیقی (Creative) ہے جس کے حوالے سے انہوں نے خدا، ذات، کائنات اور زندگی کے تمام نکات کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ مجیبی کا اللہ پر مکمل یقین ہے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار مل جائیں گے جس سے ان کے جذبۂ عبودیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مجیبی کو خدا شانِ رحیمی پر ایقان ہے۔ اللہ کی حاکمیت پر بھروسہ ہے۔ جزا وسزا کا اسلامی نظریہ رکھتے ہیں۔ اپنی باتوں کی تائید میں چند اشعار پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان کی فکری تشکیل بڑے کمال کی ہے۔ دیکھئے یہ اشعار۔

اسی عالم میں تو ملتا ہے خدا تو مجھ کو
ٹوٹ جاتے ہیں جہاں سارے سہارے میرے

—

خدا سنوارے تو دنیا سنور بھی سکتی ہے
الگ ہے سب سے مگر نقطۂ نظر میرا

—

منصف نہ بنا دہر کو اعمال کے میرے
یارب ترا مجرم ہوں سزا تو ہی مجھے دے

—

غزلوں کے تجزیے کے بعد ایک ایسے شاعر کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے جس کی شاعری میں حالات کا کرب بھی ہے اور کلاسیکی بلوغت بھی۔ مجیبی ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ حساس دل ودماغ رکھتے تھے۔ اسی احساس نے ان کے لفظوں میں تلخی اور تندہی پیدا کر دی ہے مگر لہجے کی شاعرانہ دلکشی شاعری کی شعریت اور طہارت کو نقصان پہنچنے نہیں دیتی۔ مجیبی کی شاعری میں جذبہ واحساس کی شدت ہی ان کی شاعری کی مقبولیت اور آفاقیت کی ضامن ہے۔ انہوں نے غزل کی قدیم تہذیبی روایتوں کو بھی اکتساب فیض کیا ہے اور جدید رجحانات سے بھی استفادہ کیا۔ ان کی شاعری میں جس تخلیقی جنوں کی مہک ہے، وہ پڑھنے والے کو نئی آگہی اور دل کو نئی روشنی عطا کرتی ہے ساتھ ہی مست وبے خود بھی بنا دیتی ہے۔

صدیق مجیبی کی شاعری میں استعاراتی نظام

جدید غزل کی شناخت موضوع سے کہیں زیادہ موضوع کی پیشکش کے طرز اظہار اور اسلوب بیان کی مرہون منت ہے۔ یوں تو شاعری میں استعارہ علامت اور کنایہ کا استعمال کوئی نئی بات نہیں لیکن جدید شعراء علامتوں اور استعاروں کی بازیافت کو اپنی ترجیحات میں شمار کرتے ہیں۔ عصری غزل میں ہمارے شعراء نے اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے بھرپور طریقے سے کیا ہے۔ صدیق مجیبی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ صدیق مجیبی کے تمام تخلیقی منظر نامے استعاراتی نظام اور علامتی امکانات سے معمور ہیں جن کے تناظر میں صدیق مجیبی کی حسیت کو مکمل طور پر جانا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً ان کے فکری رجحان فن میں خواب، سمندر، صحرا، دریا، سورج اور ان کے تلازمات وغیرہ پر مشتمل علامتیں ہیں جو تہہ دار مفہوم ادا کرتی ہیں اور معنوی قوت موجود ہے۔

صدیق مجیبی نے اپنی شاعری میں ''خواب'' کے استعارے کو مختلف مفاہیم میں ادا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں خواب دیکھنے کی تمنا شدید طور پر موجود ہے لیکن یہ خواب تمناؤں، خواہشوں اور آرزوؤں کی عدم تکمیل کا اشاریہ بن جاتا ہے پھر یہ کہ شاعر خواب دیکھے تو کیسے؟ اسے تو نیند ہی نہیں آتی جو خواب کے لئے شرط اولین ہے۔ مجیبی کے یہاں خواب اور شکست خواب کا استعارہ علامتی معنویت کے ساتھ اجاگر ہوا ہے۔ ان کے یہاں خواب زندگی کی الجھنوں اور انتشار کی صورت میں نظر آتا ہے اور کہیں شکست خواب کی اذیت اسے احساسِ زیاں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ دیکھئے یہ اشعار۔

نیند کہاں اب تو رہتی ہے آنکھوں میں زہر آب کی دھند
مٹی کا دل چیر کے سارے خوابوں کو در آئے ہم

—

فصیل درد سے یاروں کی دھوپ ڈھلتی ہوئی
بکھرتے ٹوٹتے رنگوں کا خواب چاروں طرف

—

خواب ہی خواب نہ ہوں خواب کی تعبیریں بھی
دیکھئے ہم سے کب ارباب کہف کھلتے ہیں

—

خواب مسمار ہوئے سب مرے
ہاتھ اس میں بھی خدا کا کچھ ہے

—

پہلے شعر میں شاعر خوابوں سے منحرف ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اس لئے کہ اس کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ اس شعر میں حزنیہ استفہام موجود ہے اور یہاں خواب عدم تکمیل تمنا کی علامت ہے۔ دوسرے شعر کا دوسرا مصرع ''بکھرتے ٹوٹتے رنگوں کا خواب چاروں طرف'' اس بات کی طرف توجہ مبذول کرتا ہے کہ عصری حقیقتوں کے سنگ ہائے گراں خوابوں کو چکنا چور کر رہا ہے۔ دوسرے مصرع میں شاعر نے خواب کے وسیلے سے عصری زندگی کے تلخ حقائق، اقدار کی شکست کا اظہار کرتا ہے۔ صدیق مجیبی کو اپنے عہد کی لا محفوظیت کا زبردست احساس ہے۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرع ''خواب ہی خواب نہ ہو خواب کی تعبیریں بھی'' میں شاعر خوابوں کی مسیحائی کا متمنی ہے جسے ایک اسلامی تلمیح سے تقویت بخشی گئی ہے۔ اس طرح صدیق مجیبی نے زندگی کی معنویت اور مقاصد کو خواب کے استعارے کے حوالے سے گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ آخری شعر میں خواب کی کیفیات کو حساسیت کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ شاعر کی داخلیت پسندی نے اسے متردود کر دیا ہے۔ ''خواب مسمار ہوئے سب مرے'' ایسے فرد کے کرب آگہی کا اظہار ہے جس کا بہت کچھ یا سب کچھ کھو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرا مصرع ''ہاتھ اس میں بھی خدا کا کچھ ہے۔'' میں جو بے چینی اور بیزاری ہے اپنے عہد کی لامحفوظیت اور شکست خواب کی اذیت کا زائیدہ ہے جس نے فنکار کو مذہب بیزاری میں مبتلا کر دیا ہے۔

صدیق مجیبی کی شاعری میں علائم و رموز کا ایک دائرہ سمندر، صحرا، دریا اور ان کے انسلاکات ساحل ، کشتی، موج، حباب، بھنور، طوفان، بادبان وغیرہ سے بنتا ہے۔ سمندر جو کہیں وسعت اور بیکرانی کا استعارہ ہے تو کبھی خطرات اور غیر یقینی کیفیت کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ صدیق مجیبی کی شعری کائنات میں سمندر کا استعارہ بے بسی اور بے چارگی کی کیفیت کو بھی اجاگر کرتا ہے اور کہیں استغنائی مزاج کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں سمندر کے حوالے سے چند اشعار پیش کرنا ہوں گا۔

کس سمت اندھیروں میں بڑھوں سوچ رہا ہوں
صحرا کو جگاؤں کہ سمندر کو صدا دوں

—

سات سمندر جیسا چپ ہے دھوم مچانے والا
اپنے دل کی دیواروں سے سر ٹکرانے والا

—

تو دیکھ ظرف کبھی آزما کے میرا بھی
اٹھا کے سارا سمندر میرے حباب میں رکھ

—

پہلے شعر میں شاعر نے عہد کی لامحفوظیت کو استفہامیہ لہجے میں بڑی تہہ داری سے پیش کیا ہے۔ المناک کیفیات کو تخلیقی تجربے کا جس طرح حصہ بنایا گیا ہے اپنے عہد کی روح کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس شعر میں واحد متکلم عصری زندگی کی آگہی کے کرب سے دوچار ہے۔ دوسرے مصرع ''صحرا کو جاؤں کہ سمندر کو صدا دوں'' میں جو درد کی ٹیس اور تذبذب ہے اس میں غیر معمولی جاذبیت اور تاثیر بھی غیر معمولی ہے۔ اس شعر میں جتنا انکشاف ذات ہے اتنا ہی گرد و پیش کی دنیا پر تبصرہ بھی ہے۔ دوسرے شعر میں '' سات سمندر'' کی ترکیب میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی۔ اجتماع ضدین ''چپ ہے'' اور ''دھوم مچانے والا'' سے دوسرے مصرعے کو تقویت بخشی گئی ہے جس میں عصری زندگی کی بدلتی ہوئی حقیقتوں کو آشکارا کیا گیا ہے۔ شاعر کا ذہن افراتفری اور انتشار کی کیفیت سے اس طرح دوچار ہے کہ دیکھنے سے زیادہ سوچ میں ڈوبے ہوئے نظر آتا ہے۔ جذباتی کیفیات کے اظہار میں استغراق کی کیفیت ہے جس میں احساس کا عنصر

غائب ہے۔ تیسرے شعر میں افسردگی نہیں بلکہ اضطراب کی کیفیت ہے۔ اس شعر میں واحد متکلم ایک حساس ، غیرت مند اور باشعور انسان کی ترجمانی کر رہا ہے جس میں شان استغنا بھی ہے اور تحرک مزاجی بھی اور خود اعتمادی اس کے ظرف اور ضمیر کا زیور ثابت ہو رہی ہے۔ اپنی ذات کی گہرائیوں سے ابھرنے والی جذباتی لہروں پر اسے اتنا بھروسہ ہے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ''اٹھا کے سارا سمندر میرے حباب میں رکھ'' میں تیقن بھی ہے اور تحکم بھی جو طنزیہ Mode لئے ہوئے ہے۔ لیکن کسی ایک لفظ سے بھی متکلم پر ذہنی تناؤ یا نفسیاتی الجھنوں کا گمان نہیں ہوتا۔ مجھے کہنے دیجئے کہ صدیق مجیبی کی تخلیقات کی ترسیلی قوت ان کے تجربوں کی دین ہے جو دل میں اتر جانے کی قوت رکھتی ہے۔ وہ شعوری طور پر کسی بات میں ہاں میں ہاں ملانے کے قائل نہیں بلکہ پوری آگہی اور بے باکی سے جذبہ دل کا اظہار اپنی داخلی شخصیت میں جذب کرتے ہوئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ شعر کے رنگ و آہنگ میں تمام تر جدید حسیت کا اظہار نظر آتا ہے۔ کل یعنی سمندر کو جز یعنی حباب میں سمونے کی ترکیب میں کسی منضبط حقیقت کا انعکاس نہیں بلکہ احساس اور جذبے کی ایک ایسے پہلو کی صورت گری ہے جس میں ایک شدید داخلی احساس کی تراوش نظر آتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ لہجہ کے تکلف برطرف اور دوٹوک والے انداز نے شعر میں ایک تیکھا پن پیدا کر دیا ہے۔

سمندر کی علامت کی طرح صدیق مجیبی کی شاعری میں ''صحرا'' کی روایتی مفہوم کو نیا کر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ صحرا کا تعلق وحشت سے بھی ہے اور وسعت سے بھی۔ صدیق مجیبی اپنی شاعری کے تئیں بہت حساس اور محتاط ہیں ان کے یہاں اپنی بات اپنے ہی ڈھنگ سے کہنے کا جو انداز ہے وہ ذہن پر اثر چھوڑتا ہے۔ ان کی شاعری میں صحرا کے استعارے کے توسط سے یادداشتی پیکر کو ابھارا گیا ہے۔ دریا تغیر و تبدل کی علامت ہے اور صحرا قیام و ثبات کا۔ دوسرے مصرع میں ''یہ صحرا کبھی دریا ہوگا'' شادابی اور زرخیزی کی علامت ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ یہاں کبھی خوش حالی تھی۔ فیض رسانی تھی جواب نہیں ہے اور وہ عہد ختم ہو چکا ہے۔ لیکن راوی نے امید نہیں چھوڑی۔ وہ ماضی کے یادوں کو یاد کرتے ہیں۔ دیکھئے یہ شعر۔

کشتیاں ریت پہ بیٹھی ہیں امیدیں باندھے
ایسا لگتا ہے یہ صحرا کبھی بھی دریا ہوگا

صدیق مجیبی نے صحرا اور دریا کی علامتوں کو ساتھ ساتھ استعمال کیا ہے۔ دریا روانی کی علامت ہے جب کہ اس شعر میں فنکار اپنے گہرے مشاہدے سے کام لے کر اور خارجی حالات کے اثرات سے اپنے شعری ذہن کی توسیع کر رہا ہے۔ شعر میں تغیر پذیری کے بنیادی فلسفے کو پیش کیا گیا ہے۔ معاصر زندگی کے حالات واقعات اور کرب کو پوری آگہی اور دردمندی سے اپنی داخلی شخصیت میں جذب کر لیا گیا ہے۔ شعر کے پہلے مصرع میں افسردگی اور اضطراب کی لہر سر اٹھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جو اشاریہ ہے ماضی کے اقدار کا جو راوی کے دل سے ابھی نکلے نہیں ہیں۔ ''کشتیاں ریت پر بیٹھی ہیں'' کی ترکیب مشاہداتی پہلو کو اور بھی جاندار بنا دینے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ چند اشعار دریا کے حوالے سے دیکھئے جن میں فطرت کے مظاہر دریا کو وسیع تر معنویت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ خارجی حالات کی یہ عکاسی سپاٹ اور جارحانہ قسم کی نہیں بلکہ داخلیت کے سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

لے گئیں موجیں سفینہ بادباں رہنے دیا
غرق دریا کر دیا دریا رواں رہنے دیا

—

میں بھی ایک دریا تھا اور صحرا بہ صحرا تھا رواں
ایک وحشت تھی کہ جس نے بے نشاں مجھ کو کیا

—

مدت کے بعد درد کا دریا ہے موجزن
اے خامۂ خیال طبیعت رواں ہے چل

—

جدید غزل گو شعراء نے دریا کے استعارے میں نئے مفہوم اور نئی معنویت اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ صدیق مجیبی کے ان اشعار کو دیکھئے۔ پہلے شعر میں شاعر گذرے ہوئے زمانوں (نعمتوں) کو یاد کرتا ہے، حزن و ملال کی کیفیت بھی ہے جو پوری طرح ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔ شعر حسی پیکر کی عمدہ مثال ہے۔ دوسرے شعر میں ''دریا'' فعالیت کا اشاریہ بن گیا ہے جو وسیع تر معنویت کے ساتھ مستعمل ہوا ہے۔ ''درد کا

دریا'' کی ترکیب مخصوص طرز احساس میں رچی بسی ہوئی ہے جس میں جذباتی رنگ کو ''موجزن'' سے ''ابھارا گیا ہے۔ دوسرے مصرع میں لاشعوری کیفیات کو گرفت میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ صدیق مجیبی نے دریا'' کے استعارے مختلف مفاہیم پیدا کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ دوسرے شعر میں دریا فیض رسانی کا مفہوم ادا کر رہا ہے۔

مظاہر فطرت میں سورج بھی نئی غزل کا ایک کلیدی شعری پیکر اور معنیٰ خیز علامت رہا ہے۔ سورج حسن فطرت کا اہم ترین عنصر ہے۔ اور صبح سے شام تک منظر کی تفصیل ہے۔ سورج طلوع صبح کا ایلچی ہے جس کا آخری مسکن غروبِ شام ہے۔ صدیق مجیبی نے سورج کے استعارے کو اپنے مخصوص علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اور اس کے اندر موجود ہر معنوی پہلو کا احاطہ کیا ہے۔ دیکھئے یہ اشعار۔

سورج کو کس نے رکھ دیا میزانِ شام میں
یہ کج کلاہ خاکِ بسر کیسے ہو گیا

—

رفتہ رفتہ بادبانی دھوپ خاکستر ہوئی
شام کے چہرے پہ غم سورج کی عرفانی کا تھا

—

نوید ہے تو میں سورج کی طرح جاؤں گا
مجھے خبر ہے میرے دوستوں میں طے کیا ہے

—

سورج جھلس گیا ہے ہر اک شاخ جسم و جاں
دن ڈھل گیا تو گھر میں شبِ تار آئی ہے

—

جانے کس رات کی بانہوں میں چھپا تھا سورج
اس کی چپ ٹوٹی نہ ماتھے سے پسینہ اترا

—

ان تمام اشعار کا مدار مظاہر فطرت کے ایک عنصر سورج سے اخذ و اکتساب پر ہے۔صدیق مجیبی نے مظاہر فطرت کے مظاہر ''سورج'' کے توسط سے اپنے جذبات و احساسات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلا شعر استفہامیہ ہے جس میں سورج کی توانائیوں اور تپش کے تغیر و تبدیلی پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا گیا ہے۔سورج کے مقابل '' شام'' کی ترکیب رکھے جانے سے مفہوم کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ پہلے مصرع کو دوسرے مصرع سے تقویت بخشی گئی ہے۔ دوسرا مصرع سے پہلے کے ادراک و ابلاغ سے روشناس کرانے کا وسیلہ بن گیا ہے۔ دوسرا شعر محاکات آفرینی کی بہترین مثال ہے اور اس بات کا اشاریہ ہے کہ زندگی کبھی ایک نقطے پر مدار اور انحصار نہیں رکھتی بلکہ وہ متضاد کیفیتوں کی پابند رہتی ہے۔ دوسرے مصرع ''شام کے چہرے پہ غم سورج کی عرفانی کا تھا'' میں فنکار کی شعری تہذیب نمایاں ہے جس میں کوئی کھردرا پن، تلخ نوائی یا جھنجھلاہٹ نظر نہیں آتی بلکہ وہ تہذیب بول رہی ہے جس میں اپنا آہنگ، اثر انگیزی مضمون آفرینی اور کیفیت کا عمل دخل ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ صدیق مجیبی کی غزلیہ شاعری میں مناظر فطرت کے استعارے سب سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش ہیں جس میں ایک جذباتی اور حسی دنیا آباد ہے۔ فنکار کے مشاہدات اور اس کی اندرونی کیفیات خارجی پیکروں میں ایسی فضا خلق کرتی ہیں جو بہ یک وقت کرب آگیں بھی ہے اور خوشگوار بھی۔ تیسرا شعر رجائیت کا اشاریہ ہے لیکن جذبات کی پیش کش کا انداز دبا دبا یعنی Muted بھی ہے اور اس پر ایک نوع کے حزن اور سوز کا رنگ بھی چڑھا ہوا ہے۔''سورج کی طرح جاؤں گا'' یعنی تمام ساہ و سفید کو طشت از بام کر دوں گا۔اس شعر میں اپنی انا اور انفرادیت کا احساس بھی ہے اور ایک طرح کی سرخوشی بھی۔ چوتھے شعر میں ''سورج جھلس گیا ہے'' کی ترکیب ایک ہمہ گیر استعارہ ہے عصری زندگی کے کرب کا جو ہوش و خرد اور شعور کو متاثر کرتی ہے جس کے نتیجے میں فنکار نے اپنے تجربات و مشاہدات کو من و عن بیان کر دیا ہے۔صدیق مجیبی کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مظاہر فطرت کو وسیع تر معنویت کے ساتھ استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔''سورج'' کے استعارے کے حوالے سے اس شعر کا پہلا مصرع مایوسی، احساس زیاں اور بے بسی سے وابستہ ہے جس میں ایک جذباتی رنگ بھی جھلک رہا ہے تو دوسرے مصرع میں ''شبِ تار آئی ہے'' کی ترکیب نے داخلی قوتوں کو فعال بنا دیا ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ صدیق مجیبی کے یہاں جو استعاراتی نظام ہے ان میں عصری زندگی کے مختلف پہلوؤں کو تخلیقی بصیرت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

❋

پروفیسر صدیق مجیبی کی شاعری میں کربلا کا استعارہ

واقعۂ کربلا اور اس کے متعلقات کو موضوع شعر بنانے کا رجحان اردو شاعری کے ابتدائی دور سے ہی ملتا ہے۔لیکن اس موضوع کا اظہار تلمیح سے زیادہ استعارے کی شکل میں ہوا ہے۔ یہ استعارہ یوں تو ولی سے لے کر عہد حاضر تک ہماری شاعری کا اہم موضوع رہا ہے مگر جدید شاعری نے اس کا افق اس طرح تلاش کیا کہ سارا آشوب جہاں اس استعارے میں سمٹ آیا ہے۔ حالیہ جدید غزل میں اس کا اظہار کئی زاویوں سے ہوا ہے۔آج کا فنکار کربلا کے حوالے سے ایک نئی تاریخ مرتب کر رہا ہے۔شعری اظہار میں کربلا کی معنویت اس لئے بھی بڑھ گئی ہے کہ آج باطل اور طاغوتی نظام کے خلاف حق و انصاف کے متوالے نبرد آزما بھی ہیں اور برسر پیکار بھی۔لہٰذا جدید شاعری میں کربلا اور اس کے متعلقات کے حوالے سے احتجاج کی کیفیت بھی دیکھی جا سکتی ہے اور جبر و استبداد کا اشاریہ بھی بیان کیا گیا ہے۔کربلا کا استعارہ کہیں ذاتی غم اور مصائب کو ایک وسیع تر معنویت میں اجاگر کرنے کا وسیلہ ہے تو کہیں عمومی صورت حال کی ایک معنیٰ خیز علامت بھی ہے۔بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ:۔

> ''راقم الحروف کا خیال ہے کہ موجودہ عہد میں نئے معنیاتی تقاضوں کے تحت شہادت حسین کا تاریخی حوالہ رسمی رثائی ادب سے ہٹ کر عام اردو شاعری میں بھی پرورش پا رہا ہے اور پچھلی تین چار دہائیوں سے ایک نئے اظہاری اور شعری رجحانات کی صورت اختیار کر رہا ہے جو اپنی جگہ بے حد اہمیت و معنویت کا حامل ہے۔'' 7

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مذکورہ اقتباس سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ واقعۂ کربلا کا حوالہ اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان بن گیا ہے۔حالیہ غزل میں اس کا اظہار کئی زاویوں سے ہوا ہے۔اس کے توسط سے شعراء نے معاشرے میں پیوست ظلم و ستم اور شر پسند قوتوں کی بالادستی کو اجاگر کیا ہے تو کہیں کربلا

کا واقعہ حق اور خیر کی اعلیٰ اقدار کی پامالی کا استعارہ بن گیا ہے۔ سیاسی جبر واستبداد، عصری صورت حال کو نمایاں کیا گیا ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ ذاتی غم، عصری صورت حال اور کربلا کے مناظر ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ آج کا شاعر اس سانحۂ عظمیٰ کے واقعات اور حضرت امام حسینؓ اور ان کے جاں نثاروں کے مقصد حیات ہمہ گیری اور آفاقیت سے روشنی حاصل کر رہا ہے۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ:۔

> ''جدید اردو شاعری میں کردار حسینؓ واقعۂ کربلا اور اس کے تعلقات ایک مسلسل موضوع کی حیثیت سے موجودہ شعری رویوں کا حصہ بن کر جاری وساری ہیں۔ ایسا غزل میں ہو رہا ہے اور نظم میں بھی۔ اس موضوع کی اتنی کیفیتیں، اتنی شکلیں اور اتنے ابعاد ہیں کہ سب کا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ اظہار براہ راست بھی ہو رہا ہے اور خالص استعاراتی اور علامتی پیرایے میں بھی۔'' 8

صدیق مجیبی کی شاعری کا مرکزی حوالہ غزل ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں کربلا اور اسے متعلقات وتلازمات کو معاصر معنویت کے ساتھ اپنے مخصوص لہجہ میں مسلسل بیان کیا ہے۔ صدیق مجیبی کے معاصرین میں بہت سارے شعرا نے کربلا کے استعارے کے حوالے عصری مفاہم پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ صدیق مجیبی کی انفرادیت یہ ہے کہ کربلا کے واقعہ مناظر اور کرداروں کے توسط سے اپنے عہد کے صورت حال کو زیادہ تیکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ ظلم وستم، ناانصافی، جبر، شر پسندوں کی بالا دستی، ذاتی غم اور مصائب، اخلاقی قدروں کی پامالی، حق پرست انسان کے ساتھ مصائب وآلات کا سلسلہ، باطل قوتوں کی بالا دستی سبھوں کو کربلائی استعاروں کے ساتھ موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس تخلیقی رویے کی تہہ میں ایک طرف ہم عصر زندگی کے منظر نامے رونما ہونے والی تبدیلیاں اور ان کے نتیجے میں فرد کے داخلی و باطنی احساسات پر مرتب ہونے والے اثرات سے آگہی شامل ہے تو دوسری طرف ان استعاروں کی اساس روحانیت پر ہے۔ ایسی بات نہیں کہ واقعۂ کربلا کے حوالے سے صدیق مجیبی نے جن تلازمات کو برتا ہے وہ اردو شاعری میں نئے ہیں بلکہ صدیق مجیبی کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے الفاظ کے رموز واسرار کو بالواسطہ اور اشارتی بیانیہ کے ساتھ اتنی ہنرمندی سے برتا ہے کہ اس کی تمام معنوی وسعت کو استعارہ کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ صدیق مجیبی نے کربلا کے واقعے کو جو پہلی

صدی ہجری میں رونما ہوا اس کو پندرہویں صدی ہجری کی روئداد بنا دیا ہے۔ اپنی باتوں کو تقویت بخشنے کے لئے چند اشعار پیش کرنا چاہوں گا:۔

جس کرب سے کوفے میں گذاری ہے الٰہی
اس صبرو شرافت کا صلہ تو ہی مجھے دے

—

تمہاری تہذیب کے صحیفے تمہارے کلچر کے آئینے ہیں
یزید مانگیں گے جو سر تو دے دو مگر تم اپنی زبان مت دو

—

تیغِ ستم اُٹھی تو سبھی سجدہ ریز تھے
لیکن جو سر بلند تھا اس کا تو سر گیا

—

ان کوفیوں کے بیچ مجیبیؔ کٹی ایک عمر
اک پل بھی جن کے ساتھ گذارا نہیں گیا

پہلے شعر میں تلمیح ہے جس کے توسط سے جذبات واحساسات کی الم ناکی اور دردانگیزی کی شدت کے علاوہ نئی تخلیقی کیفیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مجیبی اپنے عہد کے اندر رہ کر ایک آفت زدہ شہر دریافت کرتے ہیں جہاں منافقت، جبر وظلم اور بربریت کا بول بالا ہے۔ ان کی نظر میں وہ آج کے عہد کا کوفہ ہے۔ اس استعارے کی معنویت میں آج کے انسان کا درد نمایاں ہے۔

دوسرے شعر میں ''یزید'' کے استعارے میں جو تہہ داری اور پرت در پرت معنویت ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس شعر میں ''یزید'' اس ذہنیت کے جبر واستبداد کا اشاریہ ہے جو اردو زبان کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کے درپے ہیں۔ زبان اور رسم الخط کا رشتہ جسم اور جلد کا ہے، جسم اور لباس کا نہیں۔ لہٰذا جسم کو جلد سے الگ کرنا غیر انسانی فعل ہے۔ اردو زبان کے سلسلے میں آزادی کے چند نامور فنکار بھی شریک ہیں۔ مجیبی اس سازش کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں۔ اردو صرف ہماری زبان ہی نہیں بلکہ ہماری تہذیب بھی ہے۔ ہمارا تمام علمی وتہذیبی اثاثہ اسی زبان کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ لہٰذا مجیبی رسم الخط کی تبدیلی کو یزید کے

ظلم وستم سے موسوم کرتے ہیں۔شعر کے دوسرے مصرع ''یزید مانگے جوسرتو دے دومگرتم اپنی زبان مت دو'' میں جو جامعیت اور معنویت ہے مجیبی کی فنی ہنرمندی پر دال ہے۔

تیسرے شعر کا تعلق بھی کربلائی استعارہ سے ہے جس کو پڑھنے کے بعد مولانا محمد جوہر کا یہ مصرعہ ذہن میں کوندنے لگتا ہے ''قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے'' ''سربلند'' اور ''سرگیا'' کی ترکیب نے شعر میں اجتماعِ ضدین کی دلکشی پیدا کردی ہے۔

مجھے کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ صدیق مجیبی جب شعر کہتے ہیں تو تخیل وتفکر کے سمندر میں ڈوب کر کہتے ہیں۔اخلاقی قدروں کی پائمالی، رشتوں کے انہدام، منافقت، خودغرضی ومفاد پرستی، سیاست کی شعبدہ بازی عصری زندگی کا کربناک والمناک پہلو ہے۔ ہر شخص کا دو چہرہ ہے جسے سمجھنا مشکل ہے۔اسی مسموم ماحول میں شاعر بھی زندگی کے شب وروز گذار رہا ہے اور کس حد تک گھٹن کا اس کو احساس ہے، چوتھے شعر میں اس کا اظہار ''ان کوفیوں کے بیچ'' کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

صدیق مجیبی کی شاعری میں واقعۂ کربلا، شہادت امام حسین، دشتِ کربلا میں امام حسین کے پورے خاندان اور ایک پوری جماعت کے ہر فرد کا اپنا سب کچھ لٹانے کا جذبہ کے حوالے سے جو پیکرا بھرتا ہے، فنکار کے تخلیقی وجدان کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ان واقعات وحادثات سے فیضاں حاصل کرنے اور اس سے گوناگوں شعری کیفیات ابھارنے کا ان کا شعری پیرایہ شدید انفرادیت رکھتا ہے۔مجیبی کی شاعری میں کربلا، کوفہ، یزید، نیزہ، لہو، سر، تیغ، پیاس، خنجر، تلوار، ریت، خیمہ وغیرہ استعارے اور تلازمے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جو عصری زندگی کے جبر واستبداد کی سفاکی کے بیان میں نئی نئی معنیاتی جہات پیدا کرتے ہیں۔ان کی حیثیت محض الفاظ کی نہیں بلکہ یہ علائم اور استعارے اس سانحۂ عظیم کی یاد تازہ کرتے ہیں ساتھ ہی فنکار کی راسخ العقیدگی اور قادرالکلام کے مظہر بھی ہیں۔اپنے دعویٰ کی دلیل میں چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

اپنا سر کاٹ کے نیزے پہ اٹھائے رکھا
صرف یہ ضد کہ میرا سر ہے تو اونچا ہوگا

—

مری جانب سلگتی ریت تھی پیاسوں کے لاشے تھے
جدھر دشمن تھے خیمہ زن اُدھر دریا نکل آیا

—

ترے رونے سے اے ابر سیہ اب فائدہ کیا ہے
قیامت تک رہے گی پیاس دامن گیر پانی کی

—

دنیاداری آس تیرے ہاتھ پر بیعت کروں
سچ کہوں تو ہو گیا ہے آئینہ میرے خلاف

—

نہ کھائی مات نہ دشمن سے صلح کی میں نے
یہی بساط مری ہے یہی ہنر میرا

—

پیاس جلی بجھی ہوئی روح گھٹی گھٹی ہوئی
حرف طلب خلافِ وضع نوک زباں بھی نہ تھا

—

یہ اشعار اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ صدیق مجیبی نے واقعہ کربلا کے مختلف واقعوں کی علامتی معنویت کو بہت ہی گہرائی سے سمجھا ہے اور اسے معاصر زندگی کے المناک صورت حال پر منطبق کیا ہے۔مذکورہ بالا اشعار کے لفظیات اور تراکیب اس بات کا اشاریہ بن جاتے ہیں کہ صدیق مجیبی کو واقعاتِ کربلا اور اس کے متعلقات میں پوشیدہ معنویتوں کا گہرا ادراک حاصل ہے جس کے نتیجے میں اس واقعے کے ان سبھی جزئیات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے جو عصری زندگی کے مسائل، المناکی اور کربناکی کے ترجمان بن گئے ہیں۔مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ صدیق مجیبی نے اپنی غزلیہ شاعری میں واقعات کربلا، اس کے تلازمات ومتعلقات کے حوالے سے ایسی کیفیتیں پیدا کی ہیں جو خاص انہیں کے تخلیقی وجدان کا امتیاز بھی

ہےاورتخلیقی عرفان کا مظہر بھی ۔ان اشعار میں امام حسین اوران کے رفقاء سے والہانہ محبت وعقیدت کا وفور بھی ہےاورشعری اظہار میں احساس کی تازگی ،نفاست اورشائستگی بھی ان کا لہجہ جدت خیال اورتازہ کاری کے دلکش اسلوب سے عبارت اوران کا یہ دعویٰ بھی سو فیصد درست ہے۔ کہتے ہیں:

اک مدرسہ ہے کربلا اُمت کے واسطے
بھولے ہوئے سبق سے سبق چاہتا ہوں میں

صدیق مجیبی کی غزلیہ شاعری کا اسلوب

غزل کی شاعری کا تعلق موضوعات سےنہیں بلکہ تجربات ومشاہدات سے ہے۔لہٰذا غزل کا فنکار اپنی غزل کی اساس جذبوں کی انوکھی صداقت کے ساتھ زبان کی زندہ اور بدلتی ہوئی لطافت پر رکھتا ہے کسی بھی فنکار کا لہجہ ہی اس کی ادبی قد وقامت کا تعین کرتا ہے ۔ لہجے کا بانکپن ہی شاعر کی غزلوں کو وقار بخشتا ہے۔زبان وبیان اورشعری رویہ ایک مستقل موضوع ہے ۔ ہر فنکار کی اپنی لفظیات ہوتی ہے جس سے زبان وبیان کے ساتھ اس کے شخصی رویے کا پتہ چلتا ہے۔

صدیق مجیبی کی شاعری اپنے اسلوب کی انفرادیت کی وجہ سے ادبی دنیا میں اپنی شناخت بنا چکی ہے۔انہوں نے اردو غزل کو نیا رنگ وآہنگ سے روشناس کرایا ہے۔اپنی غزل کی اساس جذبوں کی انوکھی صداقت کے ساتھ ساتھ زبان کی زندہ اور بدلتی ہوئی لطافت پر رکھا۔اپنی شاعری کے ذریعہ یہ بات ثابت کردی کہ شاعری میں محض اعلیٰ مضامین ہی فنکارانہ کمال کا ضامن نہیں ہے بلکہ شاعرانہ فنکاری بھی شرط اولین ہے تاکہ پڑھنے والا یا سننے والا دیر تک مزہ لے سکے۔صدیق مجیبی کی غزلوں کی مقبولیت کی بنیاد اگر ایک طرف سلیس اورنفیس زبان ہےتو دوسری طرف ان کے یہاں عمومی مشاہدات کےان دیکھے پہلوؤں کی عکاسی اورایسی نادر پیکر نگاری ہے جوہمیں متحیر بھی کرتی ہےاور متفکر بھی۔صدیق مجیبی کی شاعری اپنے عہد کی ایک معتبر آواز ہےجس نے غزل کوفکر واظہار کی وسعتوں سے مالا مال کیا۔ساتھ ہی عصری حسیت اورتازہ کارافکار سے مزین بھی کیا ہے۔ مجھے کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ صدیق مجیبی زبان وبیان کے اعتبار سے ایک منجھے ہوئے فنکار ہیں۔ان کے یہاں روایت کا احترام بھی ہےاور جذبات کی فراوانی بھی۔لفظوں کی کفایت شعاری بھی ہےاوراحساس وخیال کی ندرت بھی۔ان کی شاعری میں اسلوب کی جدت بھی ہےاور طرز اظہار کی دلفریبی بھی ۔ساتھ ہی ذہنی وفکری رچاؤ میں لہجے کا جوطنطنہ ہے،اپنی مثال آپ ہے۔ان کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک شعر بھی بھرتی کا نظر نہیں آتا۔وہ احساس میں شعریت

پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔لہٰذا شعری احساس کو بغیر کسی آرائش وزیبائش، بغیر کسی بناوٹ اور تصنع، جوں کا توں پوری وجد آفرینی کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔اپنی شاعری میں تشبیہات اور استعارات کا جو رواں اور پرزور استعمال کیا ہے اسے محض لفظی بازی گری یا زبان دانی کے مظاہرے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔صدیق مجیبی کی تخلیقات کی ترسیلی قوت ان کے تجربوں اور مشاہدے کی دین ہے۔میں یہاں چند اشعار نقل کرنے پر اکتفا کروں گا جو ان کے لہجے کی انفرادیت کا ضامن ہے۔

تم نے آئینے پہ کیوں اتنا بھروسہ رکھا
ہم تو پتھر ہی سمجھتے تھے نسب جانتے تھے

—

میں نے جس زینے پہ پاؤں رکھا مجھ کو ڈس گیا
میں نے جب بھی دانہ پھینکا سانپ کے خانوں میں تھا

—

اسی کے ہاتھ پہ دینا یہ ریزہ ریزہ خطوط
اگر وہ پوچھے کہ یہ کیا ہے تو آئینہ کہنا

—

مذکورہ بالا تینوں اشعار اشارتی بیانیہ کی عمدہ مثال ہیں جو فنکار کی بالغ نظری کا اشاریہ بن گئے ہیں۔
پہلے شعر میں تجربہ بھی ہے اور تیقن بھی۔دوسرے شعر میں عصری زندگی کی منافقت کا اظہار ہے جو شعر کی تخلیقی قوت اور شاعرانہ بصیرت پر دال ہے۔تیسرے شعر میں لہجے کی شاعرانہ دلکشی شعر کی شعریت اور طہارت کو نقصان نہیں پہنچنے دیتی اور نہ ہی کوئی ہیجان نظر آتا ہے بلکہ احساسات وخیالات کی سطح پرسکون نظر آتا ہے۔
مجیبی کی غزلوں میں ہندی الفاظ کی آمیزش اور برملا محاورے کا استعمال ان کے شعری اسلوب کا نمایاں وصف ہے۔دیکھئے یہ اشعار۔

کھڑکی بھر آکاش ہمارا بہت کہیں تو آنگن بھر
اتنے میں ہم اُڑتے کیسے رہے ترستے جیون بھر

—

پھیل جائے گی رگ و پے میں ہوس کی آگ جب
میں طلب پانی کروں گا وہ ہوا دے گا مجھے

—

پہلے شعر میں ہندی الفاظ کھڑکی، آکاش، آنگن، جیون کا برملا استعمال شاعر کے قلبی واردات کا جواز فراہم کرتا ہے۔دوسرے شعر میں ''وہ ہوا دے گا مجھے'' میں جو معنویت اور وسعت ہے پڑھنے والوں کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا کر دیتی ہے۔آیئے! مسلسل غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں جمالیاتی احساس کا سمندر ہچکولے مار رہا ہے۔ساتھ ہی صدیق مجیبی کے تخلیقی شعور کی انفرادیت بھی نمایاں ہے۔
زبان وبیان کی دلآویزی اور لب ولہجہ کا بانکپن بھی ملاحظہ ہو۔

عجیب عالم میں ہم بہم تھے بدن لہو کے سرور میں تھا
نہ رات اپنی سیاہیوں میں نہ دن اجالوں کے نور میں تھا
سلگتی مٹی پہ شام اپنی حریری چادر بچھا رہی تھی
نہ خواب پلکوں کی دسترس میں نہ ذہن حور وقصور میں تھا
شفق کہ گلنار ہو چکی تھی ، فضا کہ سرشار ہو چکی تھی
نگاہ دل کا لطیف نغمہ سکوت لب کے ظہور میں تھا
دھنک کے جھولے میں دل کا موسم وصال کے گیت بن رہا تھا
مجھے تو یہ بھی خبر نہیں تھی قریب تھا میں کہ دور میں تھا
میں تھک چکا جب تو اپنی کشتی بھنور کے خود ہی سپرد کر دی
ہزار طوفاں تھے بادباں میں کھلا سمندر غرور میں تھا
رفیق کو کیوں رقیب کرلوں حکایت شب سنا کے اپنی
کہ شام سے تاسحر مجیبی نہ نہ پوچھ کس کے حضور میں تھا

—

غزل کے ان تمام اشعار کے اسلوب میں جو بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ اسلوب میں سادگی اور اس کے بطن میں پیدا ہونے والی فکری پیچیدگی ہے۔ تمام اشعار تخلیق کے پیکر میں خود بخود ڈھلتے نظر آرہے ہیں۔ پوری غزل میں سرمستی بھی ہے اور دل پذیری بھی۔ بقول طلحہٰ رضوی برق:

> ہر شاعر کی اپنی لفظیات ہوتی ہے جس سے زبان و بیان کے ساتھ اس کے شخصی رویے کا پتہ چلتا ہے، کہنا ہوگا کہ صدیق مجیبی کے بھی کچھ مخصوص الفاظ ہیں جو ان کی شاعری میں بتکرار ملتے ہیں اور ان کے محورِ فکر کی غمازی کرتے ہیں۔ 9؎

صدیق مجیبؔی کی نظم نگاری

یوں تو صدیق مجیبی ایک بلند پایہ غزل گو شاعر کی حیثیت سے اُردو ادب میں مشہور و معروف ہیں لیکن انہوں نے کئی معیاری نظمیں بھی لکھی ہیں۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان کی نظمیں محفوظ نہیں رہ سکیں۔ ان کے دو شعری مجموعے ''شجرِ ممنوعہ'' (مرتب جابر حسین) ''پلِ صراط کے آگے'' (مرتب بابر مجیبی) شائع ہوئے لیکن کسی میں بھی ان کی نظموں کو شامل نہیں کیا گیا۔ پروفیسر طلحہٰ رضوی برقؔ نے اپنے مضمون ''صدیق مجیبی ''شکستِ انا کا شاعر'' میں چند نظموں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں '' دائرے میں چھپا ہوا دائرہ''، ''مفاہمت''، ''احتساب'' کا نام لیا ہے۔ حالانکہ صدیق مجیبی نے کئی نظمیں، قطعات بھی لکھے ہیں۔ ایک نظم بعنوان ''صندل کا شجر'' ہے جو پٹنہ سے شائع ہونے والے رسالہ ''زبان و ادب'' میں شائع ہوا تھا۔ اس نظم میں احتجاجی لے بھی ہے اور غم وغصہ کا اظہار بھی۔ بقول پروفیسر طلحہٰ رضوی برقؔ:

> ''مجیبی کی نظم ''صندل کا شجر'' یاس و امید کی ایک ملی جلی خوبصورت کیفیت کا نام ہے۔ اُردو زبان ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب ہے ایک ثقافت ہے بلکہ عطر ہے دنیا کی بہترین تہذیبوں کا۔'' 10؎

صدیق مجیبی کی نظموں میں عصری زندگی کی حقیقتیں بھی ہیں اور ماحول کی یاسیت، محرومیوں اور نارسائیوں کا حد سے بڑھا ہوا احساس کا اظہار بھی۔ ایک نظم '' دائرے میں چھپا ہوا زاویہ'' کے عنوان سے ہے۔ پوری نظم ملاحظہ ہو۔

دائرے میں چھپا ہوا زاویہ

''تیسری آنکھ کے روزن سے تکا کرتا ہے
کالا کتا

کہ اگر کوئی بھٹکتا ہوا طائر
تھک کر
آسرا لینے کو آئے تو
دبوچے اس کو
ہڈیاں توڑ کے کھالے اس کی
اور پھر اس کے لہو کا نشہ
اس کے رگ رگ میں اتر کر
اک دن
نیند کے گہرے سمندر میں
کہیں پھینک آئے''

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نظم میں صدیق مجیبی اپنے تخلیقی عمل کے دوران جذبہ وفکر کے مکمل امتزاج کو قائم رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی کسی نوع کی انتہا پسندی کے شکار نہیں ہوتے۔ اس نظم میں استعارہ سازی کا وہ فنی التزام ہے جس کے طفیل غیر یقینی صورت حال اور عصری تہذیب کے انتشار نے اندرونی کشمکش کو شدید طور پر نمایاں کر دیا ہے۔ طرز احساس کی شدت اور المناک کیفیات کو تخلیقی تجربے کا جس طرح حصہ بنایا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ نظم نہ صرف اپنے عہد کی روح کو گرفت میں لے لیتی ہے بلکہ اس روح پر جو عذاب مسلط ہو رہا ہے ان کا ہمیں گہرا شعور بھی عطا کرتی ہے۔

تنہائی کا احساس ایک عالمگیر تجربہ ہے اور انسانی فطرت کا خاصہ بھی۔ دنیا کے تقریباً ہر ادب و شاعری میں انسان کے اس احساس کو موضوع بنا گیا ہے۔ اردو شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک نظم ''تنہائی'' ملاحظہ ہو جس میں تنہائی کے احساس کو یادداشتی پیکر میں ڈھالا گیا ہے۔ الفاظ کی ترکیب نے تنہائی کے اظہار کے تناظر میں صدیق مجیبی حسیت کو مکمل طور پر جانا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو۔

❋

تنہائی

مجھ سے اک روز کہا تھا مری تنہائی نے
رات کی سد خموشی میں سحر سے پہلے
تیری آنکھوں کے سلگتے ہوئے لرزاں آنسو
دامن حسن پہ ٹپکیں تو گہر بن جائیں
صفحۂ خاک پہ ٹپکیں تو کئی پھول کھلیں
اور پھولوں پہ ٹپک جائیں تو شبنم بن جائیں
مہر انور کی ضیا پاش و منور کرنیں
اپنی پلکوں سے اٹھا لیں تو ستارہ بن جائیں
اور میں اپنے مقدر کے سیہ خانے میں
کوئی تارا ، کوئی گل کوئی گہر بن نہ سکا

مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ صدیق مجیبی نے اس نظم میں اپنے حسی تجربات کو اپنی مانوس زبان میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے جذبے اور احساس کے کرب کی صداقت ہمارے دلوں میں محسوس ہوتی ہے۔ اس نظم کی سب سے بڑی خوبی تجربے کی وحدت اور لفظ و بیان کا اختصار ہے۔

❋

صدیق مجیبی کی شاعری نقادانِ فن کی نظر میں

ڈاکٹر محمد حسن :

''صدیق مجیبی کے اشعار دل سے نکلتے ہیں اور دلوں میں ڈوب جاتے ہیں ان کی شاعری میں بناؤ سنگھار کم ہے آمد اور بے ساختگی کی کیفیت زیادہ ہے انداز بیان ایسا کہ دل سے نکلتا ہے اور دل میں کھپ جاتا ہے ان کے بعض اشعار کی کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ مدتوں تک پیچھا کرتے ہیں اور ذہن و دل پر اس طرح نقش ہو جاتے ہیں کہ شعور و لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ان کے تمام اشعار کے بارے میں کوئی حلفیہ بیان دینا تو دشوار ہے مگر چند اشعار ایسے ضرور ہیں جو پچھلے بیس برس کے لگ بھگ کم سے کم میرے ذہن پر نقش ہیں زمانے کا حساب لگایا نہیں مگر کم و بیش اتنا زمانہ ہوا ہوگا جب رانچی میں میں نے ان کی زبانی یہ اشعار سنے تھے اور ان کی بوقلمونی، رنگا رنگی اور ہمہ جہتی کا قائل ہوا تھا ان کے کلام میں حسن ادا بھی ہے اور جرأت فکر بھی۔''

مجھے بھی دیکھ مرے حوصلے بھی دیکھ ذرا
مرا تو کوئی نہیں تو نہیں خدا بھی نہیں

***

وہاب اشرفی :

''پرکاش فکری کی شاعری کی طرف رخ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ ان کا مزاج۔ PASTORAL ہے دیہی کیفیت درخت، سبزہ زار، چشمے اور عمومی معصومیت کی جو صورت ہو سکتی ہے وہ پرکاش فکری کی تخلیقی جولا نگاہ ہے۔ اس کے برخلاف ٹرائبل کلچر میں جہاں شہر دخیل ہوتا ہے، جہاں شہری زندگی کا تناؤ ہوتا ہے، جہاں بھیڑ میں چہرے نا

مانوس ہو جاتے ہیں، جہاں اقدار کی شکست اور ریخت ایک لازمی نتیجہ بن جاتی ہے، جہاں صنعتی پھیلاؤ اور مشینی زندگی انسان کو مشین کا ایک پرزہ بنا دیتی ہے وہاں یہی معصومیت جس کا ذکر اوپر ہوا اور جو ٹرائبل کلچر کی اصل شناخت کا پہلو رکھتی ہے، معدوم ہو جاتی ہے۔ یعنی ایک طرف شاعر بنیادی طور پر PASTORAL ذہن رکھتا ہے تو معصومیت یعنی فطری معصومیت کھوتا نہیں ہے اور اس کے یہاں سب خیریت ہے کا اندازہ ملتا ہے لیکن جہاں شہری الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں تو معصومیت پر ضرب لگتی ہے اور وہ شاعری پیدا ہوتی ہے جو صدیق مجیبی کا مزاج بناتی ہے یعنی سبک انداز کے مقابلے میں طمطراق، سادہ اور سہل لہجے کے مقابلے میں پر شکوہ انداز، تہذیب کے مقابلے میں اس کی شکستگی، زیریں لہر کے مقابلے میں جھماکے کی کیفیت وغیرہ، یہ ہیں صدیق مجیبی تو ان کی شاعری کی تفہیم کے لئے ایک ایسی وراثت ذہن میں رکھنی پڑے گی جس کا سلسلہ حالی سے شروع ہوتا ہے۔ اقبال کے یہاں ایک نئی صورت اختیار کرتا ہے، جوش کے طنطنے میں بدلتا ہے اور ان سب سے پہلے مصحفی اور انیس کی بلند آہنگ آواز میں ملتا ہے۔ صدیق مجیبی ایسے ہی امکانات کو نئے احساسات کے ساتھ برتنے کی خبر دیتے ہیں اور انہیں سے استفادہ اور اکتساب کرتے ہیں ان کے معاصرین میں کچھ شعراء یقینی ایسے ہیں جن کے متون کی بازگشت ان کے بعض اشعار میں سنائی دیتی ہے مثلاً عرفان صدیقی، افتخار عارف، احمد مشتاق، افتخار عارف اور اقبال ساجد، یہ تو سبھوں کو معلوم ہے کہ آج کی بحث میں یہ بات کافی اہم ہوگئی ہے کہ کسی بھی شاعر کا متن آزادانہ طور پر تشکیل نہیں پاتا اس لئے کہ متعلقہ صنف کی لہریں جو اسلاف سے اب تک چلی آئی ہیں ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ ہوتی ہیں۔ جو لازماً کسی شعر کی تشکیل میں معاون ہیں۔ ہر چند کہ اس کا احساس خود شاعر یا مصنف کو نہیں ہوتا گویا یہ عمل دوہرا ہوتا ہے ایک تو شعوری طور پر اور ایک لاشعوری طور پر صدیق مجیبی کے یہاں یہ دونوں کیفیتیں نمایاں ہیں۔''

***

ناوک حمزہ پوری :

''۔۔۔۔۔۔علمی طور پر یہ فقیر جھارکھنڈ میں 1955ء سے 1998ء تک مسلسل مقیم رہا اور ادبی طور پر وہیں ہوش گوش والا ہوا اور قریبا نوے فیصد تخلیقی کاوشیں بھی جھارکھنڈ ہی کی آب و ہوا کی دین ہیں ۔ بدقسمتی سے یہ تمام مدت جھارکھنڈ کے دیہی علاقوں میں بسر کی یوں حضرت مجیبی سے دوبدو ملاقات کا موقع میسر نہ آیا۔لیکن ان کی شاعرانہ عظمت اور علم وادب کی خدمات کے شہرے ہمیشہ سنتا رہا اور ان سے محظوظ بلکہ مسحور ہوتا رہا۔ایک زمانہ ایسا تھا کہ جمشید پور میں حضرت احمد عظیم آبادی کا طوطی بولتا تھا تو دوسری طرف رانچی میں مرحوم پرکاش فکری اور حضرت صدیق مجیبی کی ناموری کا غوغا بلند تھا۔ پرکاش فکری ہم سے چھن گئے ۔لیکن خدا کے فضل سے حضرت مجیبی کے افکار گہر بار سے ہم ہنوز مستفید و مستفیض ہو رہے ہیں ۔ یہ ہمارے دور کے جملہ علمی و ادبی حلقوں کے وابستگان کے لئے بڑی خوش بختی کی بات ہے۔خصوصا اس لئے بھی کہ اس فقیر کی معلومات کی حد تک تخلیقی شعر وادب کے زاویہ نظر سے اس وقت حضرت مجیبی کی ہمالیائی قامت کے برابر پہنچنے والی دوسری ادبی شخصیت کم از کم جھارکھنڈ میں تو موجود نہیں ہے۔ملکی سطح پر بھی ڈھونڈنا پڑے گا۔''

عبدالقیوم ابدالی :

''مجیبی صاحب کی وہ غزل ''بھولی بسری بات ہے لیکن اب تک بھول نہ پائے ہم''، جن دنوں لکھی گئی وہ ان کے لئے انتہائی درد وکرب کے دن تھے ۔ بیوی کے انتقال کے بعد چھوٹے چھوٹے بچوں کی پریشانیاں ، ان کی بیماریاں اور ایسے میں ماں کی یادیں،خود جسم کی پیاس اور ایک رفیق غمگسار کی احتیاج ، رات رات بھر جاگنے اور ان میں جلتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ساتھ غم روزگار کی ذمہ داریاں،سارے دکھوں کا مداوا وہ بے ہوشی تھی جو انہیں کانٹوں میں گھسیٹتی رہتی تھی اور پھر اپنوں کی وہ دشنام طرازیاں اور ان کا سلوک جس نے انہیں پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں نے انہیں بار

بار پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا تھا۔فکری صاحب سے ان دنوں ان کی شب و روز کی ہم رکابی تھی ۔ وہ تو ان کی بذلہ سنجی اور طبیعت کی شگفتگی تھی کہ بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ محفل کو لالہ زار رکھنے کا فن جانتی تھی ورنہ ان سوگوار محفلوں میں آنے والوں کی وہ بھیڑ کیوں ہوتی جسے آج بھی ہم سب قیمتی سرمایے کی طرح سنجوئے ہوئے ہیں ۔اس غزل میں جو پہلا شعر انہوں نے ہمیں سنایا وہ تھا۔

نیند کہاں اب تو رہتی ہے آنکھوں میں زہراب کی دھند
مٹی کا دل چیر کے سارے خوابوں کو داب آئے ہم

پروفیسر ش اختر :

''جنہوں نے صدیق مجیبی کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے انہیں اس میں چھپی ہوئی جرأت رندانہ، بانکپن ،عزم آہنی کا تجربہ ہوگا۔صدیق کی جوانی کا دور ایک مخصوص دور کے مخصوص طبقہ کی انانیت،خود پرستی ، معاشی خوشحالی ، چھوٹا ناگپور میں مسلمانوں کی بہترین سیاسی سماجی اور عاشقانہ زندگی سے اس طرح جڑا ہوا ہے کہ آپ اس سے الگ ہٹ کر صدیق کی شخصیت اور فن کا جائزہ نہیں لے سکتے ۔ جو تیکھا پن اور انانیت کی آواز ہمیں ان کی شاعری میں سنائی دیتی ہے وہ صرف شاعری نہیں ہے ۔ میں نے ان کا وہ درد دیکھا ہے اس لئے میں ان کے لہجہ کی صداقت میں چھپی ہوئی پرجوش زندگی کی گھن گرج کو محسوس کرتا ہوں اور اکثر کہتا ہوں کہ اگر صدیق اپنی نثر پر توجہ دیتے تو اس عہد کے ایک بڑے داستان گو ہوتے ۔ ایک بڑے ناول نگار ہوتے اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے فقرے تاریخ کو ایک نادر و نایاب ادبی وتہذیبی صحیفہ عطا کرتے ۔ وہ جب یہ کہتے ہیں ۔

اپنا سرکاٹ کے نیزے پہ اٹھائے رکھا
صرف یہ ضد کہ مرا سر ہے تو اونچا ہوگا

سینے میں آگ بھر لی پہ ٹھنڈک نہ کم ہوئی
اے شوق نا مراد جہنم کہاں ہے چل

—

گر تجھ سے سنبھل پائے گراں بار امانت
لے جا مرے سر سے میری دستار بھی لے جا

—

پھر کوئی موج بلا کیسے مرا سر لے گئی
اے خدا میرے خدا تو بھی نگہبانوں میں تھا

تو فنکارانہ صداقت کا ایک انوکھا پہلو نظر آتا ہے۔

***

پروفیسر جابر حسین :

''بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی کے دوران ادبی افق پر ابھرنے والے شعراء میں صدیق مجیبی کا نام نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔صدیق مجیبی چھوٹا ناگپور کے قبائل علاقے میں پیدا ہوئے، وہیں پروان چڑھے۔قبائلی علاقوں کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تحریکوں، خصوصی طور پر ان کی باغیانہ کاوشوں اور احتجاجی، رجحانات سے ہی صدیق مجیبی کے ادبی شعور کی تعمیر ہوئی ہے۔

صدیق مجیبی کی شاعری کا ایک نمایاں وصف ان کا راست اظہار ہے۔ وہ چھپا کر اپنی محسوسات بیان کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ اس راست انداز اور شعوری معصومیت نے اکثر ان کی شاعری کو ایک روحانی تقدس سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ صدیق مجیبی کی غزلوں میں تشکیل اور تجسس کا پہلو بھی قاری کو حد درجہ متاثر کرتا ہے۔''

***

پروفیسر احمد سجاد :

''یہ سچ ہے کہ بعض اوقات جزوی فرق کے ساتھ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ چنانچہ اس وقت جھارکھنڈ کی راجدھانی رانچی میں میر۔ درد۔ اور سودا کی طرح پرکاش فکری، وہاب دانش اور صدیق مجیبی اردو شاعری کے تین ستون ہیں۔صنف غزل کی شاندار روایت اور فنی نزاکتوں کی طویل تاریخ میں کسی شاعر کی انفرادیت اور اس کی آواز کا جادو جگنا کوئی آسان کام نہیں۔مگر صدیق مجیبی کی زندگی کے تہلکوں، ان کی افتاد طبع اور حالات کے تھپیڑوں نے ان کی غزلوں کو جدید اردو شعری تناظر میں چیزے دیگر بنا دیا ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک مخصوص قسم کی طرحداری، بانکپن، کج کلہی اور طنطنہ کو ان کا ہر قاری بیک نظر محسوس کر سکتا ہے۔جس میں عہد جدید کی مادی ترقی مگر اخلاقی زوال اور منافقت کی دوپاٹ میں انسان کی بے بسی اور کشمکش، ضمیر کی خلش، قبائلی بے ریائی، جیون ساتھی کی جانکاہ جدائی، رومان و جمال کی کج ادائیوں کے تلخ و شیریں تجربات ہی نے انہیں سب سے منفرد بنا دیا ہے۔''

***

ڈاکٹر منظر حسین :

''صدیق مجیبی عہد حاضر میں اردو غزل کی ان معتبر آوازوں میں سے ایک ہیں جن کے یہاں احساس کی تازگی، جذبے کی شدت اور فکر کی گونج دور دور تک سنائی دیتی ہے۔مجیبی اپنی عمر کی آٹھویں دہائی کے قریب پہنچ چکے ہیں اور ان کا شعری سفر بھی تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔اس طویل مدت میں انہوں نے کتنے نشیب و فراز دیکھے۔سائنسی ایجادات اور مغربی علوم کی رحمتیں اور زحمتیں بھی دیکھیں اور ادبی افق پر ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال کو بھی دیکھا۔فرائڈ کی دروں بینی اور اس کے نفسیاتی تجزیے کی مقبولیت بھی دیکھی۔اس کے علاوہ علامت نگاری، رومانیت، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات و پس ساختیات وغیرہ جیسے نظریات و رجحانات کی موافقت

اورمخالفت میں گروہ بندی کا منظر بھی دیکھا لیکن مجیبی نہ تو کسی ازم کے ثنا خواں رہے اور نہ ہی کسی مخصوص نظریے کے اسیر۔ ان کی شاعری کلاسیکیت، رومانیت اور ترقی پسندی تینوں کے امتزاج کی انفرادیت کے ساتھ غماز ہے۔ مجیبی کی شعری جمالیات بنیادی طور پر انفرادی احساسات و تجربات کی پروردہ ہے۔ ان کی آواز اپنے تجربوں کی آواز ہے جس کی گونج نہ صرف ذہنوں کو جھنجھوڑتی ہے بلکہ قاری کے دلوں کی دنیا کو بھی تہہ و بالا کر دیتی ہے۔

❋

مشتاق احمد نوری :

’’ اس میں شک نہیں کہ صدیق مجیبی کی پرورش غموں کے درمیان ہوئی۔ یہی کیا کم ہے کہ دو سال کی عمر میں وہ بچہ گھر سے بے گھر ہو گیا۔ اس نے اپنے دل میں غموں کا ایک جہاں آباد کر رکھا ہے اور ستم ظریفی یہ کہ وہ اس زمانے میں جب لوگوں کو خود سے فرصت نہیں وہ اس خواہش میں مبتلا ہے کہ کوئی تو ایسا ملے جو اس ویرانی کی سیر کرے جو اس کی زندگی کا حصہ ہے۔

کوئی ایسا نہیں ملتا جو مجھ میں ڈوب کر دیکھے
مرے غم کو جو میرے دل کی ویرانی میں رہتا ہے

اپنے اسی غم سے گھبرا کر وہ دوستوں کے درمیان پناہ لیتا ہے لیکن یہاں بھی تنہائی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اپنے شب و روز گزارنے کی اس کیفیت کو اس نے بہت اچھوتے انداز میں یوں بیان کیا۔

کچھ اس طرح سے مجیبی بسر ہوئے شب و روز
سلگتی ریت پہ ہو جیسے آبجو زندہ

سلگتی ریت پر آب جو کی زندگی کتنے پل کی؟ اس کیفیت میں جو کرب پنہاں ہے وہ کسی سے پوشیدہ ہے کیا؟ مجیبی دوستوں کے درمیان ہمیشہ چہکتے رہتے ہیں۔ انہیں بھی دوستوں سے شکایت رہتی ہے لیکن وہ دوستی کا بھرم قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ مظہر امام نے دوستوں سے گھبرا کر کہا تھا:

دوستوں سے ملاقات کی شام ہے
یہ سزا کاٹ کر اپنے گھر جاؤں گا

لیکن مجیبی کے لئے دوستوں سے ملاقات سزا نہیں رہی۔ بلکہ انہیں تو ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا ہے کہ ان کے دوست کسی بھی حال میں سرنگوں نہ ہوں۔ ان کا انداز دلیرانہ دیکھئے۔

دیکھتے کیسے مجیبی دوستوں کو سرنگوں
ہم نے دانستہ حساب دوستاں رہنے دیا
حساب دوستان کرتے تو حرف آتا تعلق پر
اٹھا رکھا اسے اور گوشوارہ رکھ لیا میں نے

ایسا نہیں کہ انہیں دوستوں سے تکلیف نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں وہ چیختے چلاتے نہیں بلکہ کف افسوس ملتے ہوئے یوں اظہار کرتے ہیں۔

شہر میں کچھ لوگ قاتل ہیں تو کچھ منصف بھی ہیں
دوستوں نے اس یقیں کو بھی کہاں رہنے دیا

اپنے دشمنوں کو ہر کوئی اپنے انداز سے آزماتا ہے یا دشمنی نبھاتا ہے۔ لیکن صدیق مجیبی کا انداز سب سے نرالا ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے دشمنی کر کے دشمنوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

ہاتھوں سے دوستوں کے میں ہو جاؤں گا شہید
سینے میں دشمنوں کے کسک چھوڑ جاؤں گا

ایک وار میں انہوں نے دوست دشمن دونوں سے اپنا حساب چکتا کر لیا۔ صدیق مجیبی کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ حالات کے سامنے سپر نہیں ڈالتے بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ دنیا کی صعوبتوں سے گھبرا کر میدان چھوڑنا ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ ان کے اس ہمت و استقامت کا اظہار جا بجا ان کے اشعار میں ملتا ہے۔

❋

انتخاب کلام

حمدیہ غزل

"کُن" بول نئے ارض و سما تو ہی مجھے دے
پرواز عطا کی تو فضا تو ہی مجھے دے

منصف نہ بنا دہر کو اعمال کا میرے
یارب ترا مجرم ہوں سزا تو ہی مجھے دے

کس سے میں کروں جا کے شکایت تری مولا
تو مجھ سے خفا ہے تو خدا تو ہی مجھے دے

سو بار پکارا تجھے تو نے نہ صدا دی
اب میں ہوں خفا تجھ سے صدا تو ہی مجھے دے

دل کشتۂ حالات ہے، دکھ اس سے سوا ہے
تو قادر مطلق ہے شفا تو ہی مجھے دے

ستاری و غفاری ترے بحر کی موجیں
میں خاک برہنہ ہوں قبا تو ہی مجھے دے

میں بندۂ عاجز نہ زباں ہے نہ سلیقہ
استاد ازل درس دعا تو ہی مجھے دے

جس کرب سے "کوفے" میں گذاری ہے الٰہی
اس صبر و شرافت کا صلہ تو ہی مجھے دے

نعتیہ غزل

نزول گریہ سے حرف دعا چمکنے لگا
جو ابر برسا مرا راستہ چمکنے لگا
یہ کون آیا کہ قدموں کی دھول سے اس کے
فراز کوہ پہ غار حرا چمکنے لگا
درود پڑھ کے جو چہرے پہ ہاتھ پھیر لیا
تو داغ سجدہ ستارہ نما چمکنے لگا
خیال کا جو سرا مل گیا مدینے سے
مثال ماہ مرا مدعا چمکنے لگا
وہ نور قامت و پیکر کی آمد آمد سے
زمیں سے عرش تلک سلسلہ چمکنے لگا
تمام دن تھا تصور میں گنبد خضرا
ڈھلی جو شام ترا نقش پا چمکنے لگا
مجیبی نام محمدؐ کی برکتوں کے طفیل
نَفَس نَفَس مرا زرتار سا چمکنے لگا

❋

غزل

سورج ایسا سرکش ، جیوٹ شام ہوئی تو ڈوب گیا
تم جیتے ہو جیئو بھائی اپنا جی تو اوب گیا
میری تلخ نوائی سے اب اپنے کان بچاؤ تم
میرے طرز تخاطب کا وہ حسن گیا اسلوب گیا
غیروں کے غم اپنانے کا کھیل ہی جان کا جوکھم ہے
لمبے بالوں والا جوگی زندہ ہی مصلوب گیا
آئینہ پتھر سے ٹوٹے یا دل ٹوٹے باتوں سے
جس کو یہ فرصت ہے سوچے کیا کمتر کیا خوب گیا
کس نے اس کے کرب کو سمجھا کس نے مجیبی کو جانا
جیتے جی مصلوب رہا وہ ، مر کر بھی معتوب گیا

❋

غزل

جس میں اک تصویر ہے روشن اس پانی کا نام بتا
گم صم چپ آئینے اپنی حیرانی کا نام بتا

مرے سنگار درختوں کو بھی موسم نے ویران کیا
جنگل جنگل نوحہ کرتی عریانی کا نام بتا

مٹی، آگ، ہوا اور پانی جس پیکر میں رنگ بھریں
لاثانی شہکار کی لیکن ارزانی کا نام بتا

شہرت کی پامال زمینوں پر رکھتے کیا خاک قدم
ہم تو ہوئے رسوائے جہاں اس ناکامی کا نام بتا

دریا جس کی راہ نہ روکے، صحرا جس کے ساتھ چلے
من کی موج میں بہنے والے سیلانی کا نام بتا

ہم ہیں خوب مجیبی واقف تیرے طور طریقے سے
دشمن جس کو کہتا ہے تو اس جانی کا نام بتا

غزل

موج در موج سرابوں میں پگھلتا دوزخ
ریگ زاروں پہ رواں آگ کا دریا دوزخ

چاندنی گوشۂ تخیل میں سہمی سمٹی
قریۂ جاں میں لہو رنگ دہکتا دوزخ

سرد کمرے کی خموشی در و دیوار کی چپ
بے شکن بستر بے خواب سراپا دوزخ

آگہی پنجۂ آشوب میں دل کو تھامے
مجلس غم میں کہیں در نہ دریچہ دوزخ

دھوپ کا نیزۂ سر تیز لہو میں پیوست
رات آغوش کشا خوف کا چہرہ دوزخ

جانے اس دھند کے اس پار مجیبی کیا ہو
عین ممکن ہے ادھر بھی ہو ادھر سا دوزخ

غزل

بے کراں سمجھا تھا خود کو کیسے نادانوں میں تھا
آسماں بکھرا تو ہر سو شبنمی دانوں میں تھا

میں نے جس زینے پہ رکھا پا تو مجھ کو ڈس گیا
جب بھی دانہ میں نے پھینکا سانپ کے خانوں میں تھا

پھر کوئی موج بلا کیسے مرا سر لے گئی
اے خدا ، میرے خدا ، تو بھی نگہبانوں میں تھا

اک لہو کی بوند تھی لیکن کئی آنکھوں میں تھی
ایک حرف معتبر تھا اور کئی معنوں میں تھا

سوچتے ہیں کس طرح اس شہر میں جیتے رہے
آستیں میں سانپ تھے اور زہر پیمانوں میں تھا

جانے کیسی تھی مجیبی آگ اس کے لمس کی
جسم کا سونا پگھل کر سب مری رانوں میں تھا

❁

غزل

چہرہ ثابت ہے نہ پندار سلامت اب کے
سرخرو ہو گیا ہر سنگ ملامت اب کے

پھر کھڑا ہے سر بازار برہنہ کوئی
دیکھیں کیا کہتی ہے میزان شریعت اب کے

سونپ دوں کس کو میں دستار فضیلت اپنی
آپڑی اس کو مرے سر کی ضرورت اب کے

آزری ، بھول گئی چہرہ نمائی کا ہنر
کسی پتھر سے نہ نکلی کوئی صورت اب کے

میں کہ چپ چاپ تہی دست کھڑا تھا ششدر
آئینہ دیکھ رہا تھا مری صورت اب کے

دشمن جاں تھا زمانہ تو کسے تھی پروا
اپنی ہی ذات سے لیکن ہے عداوت اب کے

❁

غزل

منصف ہے تو یہ عذر سیہ کار بھی لے جا
سورج کو کسی دن پس دیوار بھی لے جا

گر تجھ سے سنبھل پائے گراں بار امانت
لے جا مرے سر سے مری دستار بھی لے جا

بے وصف تو یہ کج کلہی کام نہ دے گی
لے مجھ سے مری وضع طرحدار بھی لے جا

لے جائیں گی موجیں ہی بہا کر مجھے اس پار
لے میرا سفینہ ، مری پتوار بھی لے جا

افسانۂ دل ختم ہوا مرگ انا پر
آ دست اجل لے مرا شہکار بھی لے جا

اک ٹوٹا ہوا دل ہے مرے پاس مجیبی
بک جائے تو اس کو سر بازار بھی لے جا

❋

غزل

روشن ہے بادبان ، ہوا مہرباں ہے چل
موج بلا ہے خفتہ سفینہ رواں ہے چل

سینے میں آگ بھر لی پہ ٹھنڈک نہ کم ہوئی
اے شوق نامراد جہنم کہاں ہے چل

دشت سراب و سنگ میں سایہ نہ کر تلاش
فکر نجات حوصلۂ رائگاں ہے چل

اس وقت آفتاب کا چہرہ بھی گرد ہے
چاروں طرف کثیف دھواں ہی دھواں ہے چل

مدت کے بعد درد کا دریا ہے موجزن
اے خامۂ خیال طبیعت رواں ہے چل

یہ طوق تشنگی بھی مجیبی اتار پھینک
اک تیر بے خطا جہاں زیر کماں ہے چل

❋

غزل

مت پوچھ کہ کیا حال تھا اسلام سے پہلے
طالب تھے سبھی خیر کے اصنام سے پہلے
میں دیکھ چکا خاک سے تا عرش ہر ایک رسم
بس نام خدا کا ہے ترے نام سے پہلے
اک نور تھا بے نور سماوات میں روشن
تخلیق جہانِ سحر و شام سے پہلے
موجود تھی صہبائے شریعت تو ازل سے
لیکن نہ تھی گردش میں ترے جام سے پہلے
بے سایہ مگر سایۂ رحمت سر عالم
واقف نہ تھی دنیا سفر شام سے پہلے
یہ شہر ستم، شہر منافق ہے مجیبیؔ
کٹتے تھے مرے دن بڑے آرام سے پہلے

غزل

وحشت وہی ہے رقص جنوں ہے اسی طرح
اپنی روش پہ موجۂ خوں ہے اسی طرح
کیسی طمانیت ہے کہ کھلتا نہیں ہے بھید
سب لٹ چکا پہ دل کا سکوں ہے اسی طرح
جینے کی شرط ہار چکیں دل کی دھڑکنیں
شوق وصال یار فزوں ہے اسی طرح
اندر سے چکنا چور ہوں باہر سے خوش لباس
اپنی حدوں میں سوز دروں ہے اسی طرح
دست ستم بدل گئے میزان ہے وہی
ہر کار خیر کار زبوں ہے اسی طرح
صدیوں سے بند ہے در زندان آگہی
دن کا زوال شب کا فسوں ہے اسی طرح

غزل

حد کرم کے بعد بھی داغ ملال رہ گیا
کاسہ تو بھر گیا مگر دست سوال رہ گیا

سب کے لئے جئے بہت سب کے لئے مرے بہت
دنیا ترے دھیان میں اپنا خیال رہ گیا

اور کچھ تو نہیں رہا اور کچھ تو نہیں بچا
ایک نہال غم پناہ دل میں بحال رہ گیا

رات تھی مختصر بہت قصۂ ہجر تھا طویل
لفظوں کو نیند آگئی ذکر وصال رہ گیا

وقت کا سیل بے پناہ اور بشر کی بے بسی
جہر کے اعتبار میں نقش زوال رہ گیا

چہرہ شام پر کھلا رنگ حجاب میکدہ
ترے کرم سے ساقیا اتنا جمال رہ گیا

غزل

قرض یوں دل پہ مرے بار و گر اس کا ہے
زخم مرے ہیں مگر سارا ہنر اس کا ہے

مجھ کو کیا خوف کہ میں حرف مکرر بھی نہیں
اپنے ہونے کا یقیں میرا ہے، ڈر اس کا ہے

سرحد جاں پہ بہت دیر سے بیٹھے ہیں کہ اب
جتنا باقی ہے سفر اور، سفر اس کا ہے

چیخ ایسی تھی کہ دیوار میں در کر جائے
دست قاتل میں جو لرزش ہے اثر اس کا ہے

درد کو ایک علاقہ ہے نہ سرحد نہ حصار
جو مرے نام ادھر ہے وہ ادھر اس کا ہے

خود کو محفوظ سمجھتا ہے فلاخن انداز
بے خبر بھی نہیں کہ آئینہ گھر اس کا ہے

غزل

یہ دنیا دار چہرے بھی بڑے دیندار لگتے ہیں
تماشا گاہ عالم میں سبھی فنکار لگتے ہیں

قیامت آچکی یہ دوسری دنیا کا دوزخ ہے
اگر ایسا نہیں تو کم سے کم آثار لگتے ہیں

بھری برسات میں دیکھو ہمارے گاؤں کا منظر
ہزاروں چھتریاں کھولے ہوئے اشجار لگتے ہیں

زمانہ ہو گیا نقل مکانی کو مگر اب تک
مجھے کیوں اجنبی میرے در و دیوار لگتے ہیں

جہاں سب مرحلے ہوتے تھے طے عشق و جوانی کے
وہ میلے اب نہیں لگتے نہ وہ بازار لگتے ہیں

انا اتنی تو زندہ ہے ابھی خانہ خرابوں میں
نہیں جاتے ہیں اس گھر پہ جہاں دربار لگتے ہیں

کہیں جائیں مجیبی دل کو کچھ اچھا نہیں لگتا
کبھی خود سے کبھی دنیا سے ہم بیزار لگتے ہیں

❋

غزل

عشق ہو جائے تمہیں بھی شب تنہائی سے
تم اگر سوچو مجھے غور سے گہرائی سے

ہم تو دیوانے ہی اچھے تھے غم ذات میں گم
ہوش کیا آیا کہ الجھے رہے رسوائی سے

ہاتھ شانوں پہ رکھا تھا ذرا رہنے دیتے
زخم دل بھر تو نہ جاتا تری بھرپائی سے

ختم ہوتا ہے کہاں ترک تعلق سے لگاؤ
ہم تو مارے ہی پھرے شہر میں سودائی سے

لذت ہجر ہے تخئیل میں تمثال وصال
ہم تو واقف بھی نہ تھے رمز شناسائی سے

یوں ہوئے چور مرے خواب مجیبیؔ جیسے
فرش پر مار دے شیشہ کوئی بالائی سے

❋

دائرے میں چھپا ہوا زاویہ

''تیسری آنکھ کے روزن سے تکا کرتا ہے
کالا کتا
کہ اگر کوئی بھٹکتا ہوا طائر
تھک کر
آسرا لینے کو آئے تو
دبوچے اس کو
ہڈیاں توڑ کے کھا لے اس کی
اور پھر اس کے لہو کا نشہ
اس کے رگ رگ میں اتر کر
اک دن
نیند کے گہرے سمندر میں
کہیں پھینک آئے''

تنہائی

مجھ سے اک روز کہا تھا مری تنہائی نے
رات کی سرد خموشی میں سحر سے پہلے
تیری آنکھوں کے سلگتے ہوئے لرزاں آنسو
دامنِ حسن پہ ٹپکیں تو گہر بن جائیں
صفحۂ خاک پہ ٹپکیں تو کئی پھول کھلیں
اور پھولوں پہ ٹپک جائیں تو شبنم بن جائیں
مہرِ انور کی ضیا پاش و منور کرنیں
اپنی پلکوں سے اٹھا لیں تو ستارہ بن جائیں
اور میں اپنے مقدر کے سیہ خانے میں
کوئی تارا، کوئی گل کوئی گہر بن نہ سکا

منظوم خراجِ عقیدت

قصیدہ درمدح

عالی جناب ڈاکٹر سید احمد گورنر جھارکھنڈ

منجانب : ڈاکٹر صدیق مجیبی، رانچی (جھارکھنڈ)

توصیف کروں پہلے خدا وند و نبیؐ کی
پھر آل و صحابہ کی و مولائے علیؓ کی
ائمہّ اطہار کی حسنین جری کی
پھر اولیاء اکرام کی حب الوطنی کی

اسمائے مبارک سے طہارت ہو زبان کو
تاثیر ملے جس سے طلاقت کو، زبان کو

اللہ کے دربار مین ہر شخص گداگر
کرتا ہے خزف ریزے کو جب چاہے وہ گوہر
یہ اس کی مشیت ہے کرے جس کو تونگر
ہے کاتب تقدیر وہی اکبر و داور

یہ اس کی عطا ہے جسے علام بنا دے
خلقت میں اسے صاحب اکرام بنا دے

گلزار وطن کنج میں تیرے ہے وہ بلبل
گل بانگ میں مقصود ہے پیغام صلح کل

جس ہاتھ نے اردو کے سنوارے خمِ کاکل
گفتار کہ جیسے چلے موج بوئے سنبل

نازش میں، تدبر میں، تحمل میں، خودی میں
کمیاب ہیں اس وصف کے انسان صدی میں

ہاتھوں میں قلم ہو تو کھلیں پھول ورق پر
جیسے کہ پڑے چھینٹ سی دامانِ شفق پر
ہے عشق بھی مٹی سے نظر بام افق پر
لغزیدہ کبھی ہو نہ سکے جادۂ حق پر

پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے ایوان میں آئے
جیسے کہ صبا صحنِ گلستان میں آئے

مقتل سے کبھی منزلِ دشوار سے گذرے
زنجیرِ قفس ٹوٹی چمن زار سے گذرے
دامن کو بچائے رہ پر خار سے گذرے
یوسف کی طرح بزم گلعذار سے گذرے

کیا کیا نہ مناصب کے قلم دان ملے ہیں
اس پر بھی مصفا ترے دامان ملے ہیں

آنکھوں میں نیا خواب نئے ہند کی تصویر
تحریر میں تقریر میں ہے امن کی تفسیر
یہ فکر مساوات کی کیسے بنے زنجیر
سینے میں مچلتا ہوا اک جذبۂ تعمیر

یکجہتی وشفقت کا مرقع ہے تری ذات
عوام میں امید و توقع ہے تری ذات

تصنیف میں تقریر میں روشن ترا کردار
بے مثل تری سادہ مزاجی تری گفتار
تو ہند کی مٹی کی محبت کا وفادار
معمور کتابوں میں ترا جذبۂ احرار
حاکم بھی تو ہی سید و سرور بھی تو ہی ہے
ناقد بھی مورخ بھی ہنرور بھی تو ہی ہے

آمد سے تری عدل و عداوت کی بڑھی شان
فریاد رسی کم تھی پریشان تھے انسان
دربار تلک آنے کی راہیں ہوئیں آسان
ہے پیکر اخلاص کی تابندہ یہ پہچان
سطوت بھی جلالت بھی نجابت سے متصّف
مکنون تری ذات میں اک اعلیٰ مصنّف

ہر سمت تحرُّک سے فضا ہو گئی شاداب
شعرو سخن و فن کی بھی روشن ہوئی محراب
پژمردہ دلوں کو ملی جینے کی تب و تاب
روشن ہوئے امکاں تو ترقی کے کھلے باب
یہ طرز جہاں بانی ہمیں یاد رہے گی
توقیرِ سخن دانی ہمیں یاد رہے گی

ممدوح کو حاصل شرفِ تاجوری ہے
الفت ہے سبھوں سے، یہ وسیع القلبی ہے
اردو کو نوازا یہ تری خوش نظری ہے
اس کا نہ کروں شکر تو یہ ناشکری ہے

اردو جسے کہتے ہیں وہ صندل کا شجر ہے
اردو کے رگ و ریشہ میں ہندی کا اثر ہے

ماتھے پہ چمکتا ہے تجربے کا اجالا
امعانِ نظر ڈالے اگر دیکھنے والا
اس دیش کو قسمت سے ملا ایسا جیالا
سنگلاخ زمین میں بھی کھلایا گل و لالہ
بے وصف تو دستار فضیلت نہیں ملتی
ادراکِ جہاں بانی وعظمت نہیں ملتی

ہیں سید احمد ترے اوصافِ حمیدہ
اس نام کی حرمت پہ فدا ہوں دل و دیدہ
صادق کے وصی کبر پرستوں سے کشیدہ
لب پر ہیں دعائیں ہوا اِتمام قصیدہ
شاعر کی دعا ہے رہے زندہ دلِ سادہ
اللہ رکھے یوں ہی دل و ذہن کشادہ

ممدوح پہ تا حشر رہے رحمت ربّی
کرتا ہے دعا دل سے یہ صدیق مجیبی

کتابیات

1. بابر مجیبی — مقدمہ، پل صراط کے آگے ص:13 تا 16
2. صدیق مجیبی — مشمولات مقدمہ مجموعہ نوائے ''ساز دل'' حیرت فرخ آبادی ص:12
3. محمد حسن — صدیق مجیبی کے کچھ اشعار مشمولہ، سہ ماہی شہپر، دھنباد، جولائی تا ستمبر 2011
4. شمس الرحمٰن فاروقی — لفظ و معنیٰ ص:126
5. مولانا ابوالکلام آزاد — غبارِ خاطر ص:182
6. جمیل مظہری — خیال کی رو، مطبوعہ ابلاغ ششماہی 1981ء
7. گوپی چند نارنگ — سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ ص:25
8. گوپی چند نارنگ — سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ ص:27
9. طلحۂ رضوی برق — صدیق مجیبی شکست انا کا شاعر مشمولہ بہار کے چند نامور شعراء حصہ اول ص:177
10. 9۔طلحۂ رضوی برق — صدیق مجیبی شکست انا کا شاعر مشمولہ بہار کے چند نامور شعراء حصہ اول ص:182

ختم شد